مؤلف
مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
خلیفہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

مکتبہ تھانوی کراچی

فہرست مضامین

باب چہارم
مسلک اشرفیہ

باب پنجم
معالجات اشرفیہ

ضروری متفرق عنوانات

پیش لفظ

از

حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ سابق پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ

تصنیف کا مطالعہ مصنف سے غائبانہ تلمذ واستفادہ ہوتا ہے اس استفادہ کا نفع بہت بڑھ جاتا ہے اگر خود مصنف کی صورت وسیرت وطبیعت سے کچھ حاضرانہ تعارف وتعلق رہا ہو۔ خصوصاً دین کے تجدیدی واصلاحی مصنف کی روحِ تجدید واصلاح کے فہم وقبول کے لئے تو اور بھی اس کی شخصیت سے آگاہی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن کسی مصنف ومصلح سے یہ حاضرانہ واقفیت بھی اس کے تھوڑے بہت معاصرین ہی تک محدود رہتی ہے۔

نعم البدل نہیں لیکن ممکن بدل اس کا صاحب تصنیف کی معتبر ومستند سوانح حیات ہوتی ہے۔ الحمد للہ کہ وقت کے سب سے جامع مجدد ومصلح مصنف (حضرت مولائی ومولانا جامع المجددین حکیم الامۃ علیہ الرحمۃ) کی ایسی سوانح خود حضرت کی لفظ لفظ نظر فرمائی کے بعد دربارِ اشرفی کے سب سے زیادہ حاضر باش اور خسرو ثانی (حضرت خواجہ عزیز الحسن نور اللہ مرقدہ) کے قلم سے تین مجلدات میں اشرف السوانح کے نام سے صاحب سوانح کی زندگی ہی میں شائع ہو چکی تھی اور بعد وفات چوتھی جلد بنام خاتمۃ السوانح کی سعادت بھی ''قلم عزیز'' ہی کے حصے میں آئی۔

گو صاحب سوانح جیسی علم وعمل، ظاہر وباطن، عدل وحکمت، جمال وجلال کی جامع شخصیت کی کامل سراپا کشی کا تو حق ادا ہی کون کر سکتا ہے کہ ''بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست'' پھر بھی جو لوگ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے نام اور کام سے برائے نام واقف یا سرے سے

نا آشنا ہیں ان کی ابتدائی معرفت کے لئے ان مجلدات کی ایسی تلخیص درکار تھی جو چند گھنٹوں کے مطالعہ و فرصت ہی میں حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کی ایک جھلک سامنے کر دے۔

حق تو یہ تھا کہ یہ مرقع حضرت سید القلم ''ایجاز رقم'' مولانا سید سلیمان صاحب مدظلہ العالی کے ہاتھ سے کھنچتا، خصوصاً جدید تعلیم کے مختلف طبقات کی کشش کے لئے، لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ سعادت ممدوح محترم ہی کے ایک مسترشد سعید اور خود تعلیم جدید ہی کے ایک فرزند عزیز (مولوی غلام محمد صاحب بی اے عثمانیہ) کو عطا فرمانا تھا جزاہ اللہ احسن الجزاء ماشاء اللہ تلخیص واختصار کے اہتمام کے ساتھ کوئی خاص پہلو چھوڑا نہیں، نیز حضرت سید صاحب ممدوح کا ایک مستقل مضمون بھی ایسا شریک کر دیا گیا ہے جو حضرت ''جامع المجدد دین'' کی تصنیفی و اصلاحی، علمی جامعیت پر حضرت سید القلم ''ایجاز رقم'' کا اعجاز مجسم ہے۔ اور یہ حیات اشرف بحمد اللہ اب ہر اعتبار سے ایسا بقامت کہتر بقیمت بہتر مجموعہ ہو گیا ہے جو بے تکلف اور بہ دلچسپی بہت تھوڑی فرصت میں عصر حاضر کی سب سے بڑی اور ہمہ گیر تجدیدی و اصلاحی شخصیت سے آشنا کر سکتا ہے۔

حق تعالیٰ مؤلف سلمہ، کی اس بروقت خدمت کو قبول و مقبول فرمائے اور اس کے پڑھنے والوں کو خود صاحب سوانح کی اصلاحی و تصنیفی افادات سے مستفید ہونے کا شوق پیدا ہو کہ راقم احقر کی فہم و نظر میں دین ہی نہیں دنیا اور مسلمان ہی نہیں انسان بننے بنانے کی راہ بھی اس عہد بے راہ روی میں اسی مصلح و مجدد وقت کی زبان و قلم کے واسطے سے کھوئی گئی ہے۔ **وما ذالک علی اللہ بعزیز**

چونکہ گل رفت و گلستان شد خراب
بوئے گل را از کہ جوئیم جز گلاب

احقر العباد عبدالباری غفرلہ

۱۶ رجب ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۳ اپریل ۱۹۵۱ء

تقریظ

از

(فاضل اجل حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سیدی حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ تھانوی قدس سرہٗ کی سوانح حیات ہمارے بھائی خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے تین جلدوں میں اور پھر اس کا تکملہ چوتھی جلد میں لکھا لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ سوانح اشرفیہ کا بیان ان چار جلدوں میں بھی دریا بکوزہ ہی کا مصداق تھا۔ مگر عام طور پر لوگوں کے مشاغل اور قلتِ فرصت کے پیشِ نظر اس کی بھی ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ان چاروں جلدوں کی ایسی تلخیص بھی ہو جائے جو قلیل الفرصت آدمی تھوڑے وقت میں دیکھ سکے اور اشرف السوانح کے اہم مضامین پر اجمالاً مطلع ہو سکے الحمدللہ کہ اس ضرورت کے لئے عزیز محترم مولوی غلام محمد صاحب حیدرآبادی نے قلم اٹھایا۔ کافی محنت اور تحقیق کے ساتھ یہ حیاتِ اشرف تصنیف فرمائی اسکے بہت سے مقامات متفرقہ کو احقر نے بھی دیکھا اور اپنے مشورے بھی مصنف سلمہٗ کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ میرے خیال میں یہ کتاب اپنے موضوع کیلئے کافی اور نہایت مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف سلمہٗ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

بندہ محمد شفیع، کراچی

۱۰ رمضان المبارک ۱۳۶۹ھ

طبع ثانی پر شکرِ مکرر

"حیاتِ اشرف" پہلی بار ۱۹۵۱ء میں چھپی اور اہلِ نظر کی نگاہ میں اس نے شرفِ قبول پایا، کئی حضرات نے اس بات پر مبارک باد دی کہ اجمال واختصار کے باوجود سوانح کا کوئی اہم پہلو چھوٹنے نہیں پایا بلکہ دیکھنے والوں نے اس میں جدید طرز کی بعض مفید اور ضروری باتوں کا اضافہ بھی وقعت کی نظر سے دیکھا جو اصل سوانح میں موجود نہ تھیں، یہ سب کچھ عطائے الٰہی کا کرشمہ ہے۔

شکر نعمتہائے، او چندانکہ نعمتہائے او

جس ادارہ نے حیاتِ اشرف چھاپی وہ ایک نوخیز اور نا تجربہ کار ادارہ تھا، اس لئے جلد ہی ختم ہو گیا اور جب تک رہا نیم جان سا رہا، نتیجہ یہ کہ بازار میں کتاب کی طلب تھی اور کتاب ادارہ میں ذخیرۂ محفوظ بنی ہوئی تھی، وہ تو ڈھونڈنے والوں کا کمال کہئے کہ مخزن کا کھوج لگا لگا کر اسکے نسخے نکالتے رہے اور پڑھتے رہے! یہ بھی برسوں پہلے کی روئداد ہے؛

چند روز ہوئے کہ باتوں باتوں میں محبّ گرامی قدر جناب عبد المنان رحمۃ اللہ علیہ (مکتبہ تھانوی کراچی) نے حیاتِ اشرف کے طبع ثانی کا ارادہ شوق و ذوق سے ظاہر فرمایا، انکار کی وجہ نہ تھی، چنانچہ صحت کتابت اور حسن طباعت کی شرط کے ساتھ "مایۂ خویش" کو "سپرد" کرنے کا وعدہ کر لیا اور اب اس کا ایفا کر رہا ہوں۔

موجودہ ایڈیشن میں بعض لفظی ترمیمات کے علاوہ جا بجا مختصر اضافے بھی ملیں گے، اور ایک نہایت مختصر و مفید مضمون حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی اعتدال پسندی سے متعلق حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی اپنی مناسب جگہ شریک ملے گا۔ اس طرح یہ

دوسرا ایڈیشن ''نقشِ ثانی'' ہی ثابت ہوگا۔

حیاتِ اشرف پہلی بار چھپی تھی تو شیوخ طریق اشرفیہ میں سے حضرت مرشدی سید الملت علامہ سید سلیمان ندوی، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب حضرت مولانا محمود الغنی صاحب رحمہم اللہ کی ہمت افزائیاں اور مبارکبادیاں مؤلف عاجز کے شامل حال تھیں، مگر افسوس کہ آج شفقت وکرم کا کل سرمایہ ہاتھ سے نکل چکا ہے ؎

جو تھے دل کو پیارے وہ سب چل بسے
عزیز و اب اللہ ہی اللہ ہے!

دعا میری ہے اور آپ بھی آمین کہیں کہ اللہ تعالیٰ اس تالیف کے نفع کو ان حضرات گرامی کے حق میں صدقۂ جاریہ کا ذریعہ بنائے خصوصاً حضرت سیدی نور اللہ مرقدہٗ کی روح پرفتوح کو اس سے زائد از زائد سرور ونشاط عطا فرمائے کہ میری ہر سعادت اندوزی ان ہی کی ایک ایک نگاہ کا اثر معجز نما ہے، رحمۃ اللہ علیہ رحمۃً کاملۃً دائمۃً!

مورِ بے مایہ
غلام محمد
کراچی ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ
مطابق اپریل ۱۹۶۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گزارش احوال واقعی

یاد ایام جب اس عاجز نے ایک نیم مذہبی ماحول کے اندر اس دار فانی میں آنکھیں کھولیں۔ پھر اسلام کی حقیقت وافادیت سے نا آشنا لیکن ایک پیدائشی پیرو مذہب کی حیثیت سے عمر کی ابتدائی منزلیں طے کرتا رہا، اسکول کی تعلیم رفتہ رفتہ اپنا رنگ جماتی چلی گئی۔ میٹرک کے درجہ میں پہنچ کر ایک اپ ٹو ڈیٹ نوجوان بن گیا۔ مذہب سے گریز بلکہ اس سے تمسخر میں مزہ آنے لگا۔ ایف اے کا آخری زمانہ تھا کہ کانوں نے مذہبی راگ ایک ایسے مغنی سے سنی جو خود سراپا ساز تھا۔ اس کے اثر سے قلب و دماغ بچ نہ سکا۔ قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ صدر مجلس اتحاد المسلمین (اعلیٰ اللہ مقامہٗ) کی ساحرانہ تقریروں نے خود ان کی صحبت میں پہنچا دیا اور ان کی معیت نے ''کلامِ اقبال'' سے روشناس کرایا، اور اس کے اثر سے یہ عاصی ایک کٹر سیاسی مسلمان[1] بن گیا۔ لیکن پھر قائدِ ملت ہی کے درسہائے تفسیر قرآن نے ''حقیقتِ دین'' تک پہنچنے کی ایک تڑپ پیدا کردی اور قلب و دماغ پر یہ جذبہ مسلط ہوگیا، ایل۔ ایل۔ بی کا ابتدائی سال تھا کہ ارحم الرٰحمین کا اس گناہ گار پر کرم عظیم ہوا۔ ایک ہستی رونق بخش حیدر آباد ہوئی، جس کی حیثیت اس وقت تک اپنے ذہن میں ''ایڈیٹر معارف'' سے زیادہ نہ تھی، مجھ بے بصیرت کو پتہ نہ تھا کہ یہ عرفاً ''مدیر معارف'' لیکن حقیقتاً صاحب معارف ہیں۔ میں جانتا ہی نہ تھا کہ یہ ''استاذ الکل'' ہیں۔ اسلام کی ''جوئے شیر کے فرہاد'' ہیں[2] اور تھانہ بھون کے عارف کامل حضرت مولانا اشرف علی قدس سرہٗ سے بھی ان کو سند امتیاز حاصل ہے:

---

[1] ''سیاسی مسلمان'' سے میری مراد وہ ہے جس کی زبان پر اسلام کی رٹ ہو۔ باقی دل و دماغ، اعضاء و جوارح سب نذر فرسنگ رہیں۔ [2] دیکھو ''اقبال نامہ'' یعنی مکاتیبِ اقبال۔

از سلیمان گیر اخلاصِ عمل دان تو ندوی را منزہ از وغل
اے دلت معمور از اسرارِ حق اے دلت مخمور از آثارِ حق
اے دلت پر نور از انوارِ حق اے دلت مسرور از اخبارِ حق [۱]

ایک دوست کے کہنے پر پہلی مرتبہ اس ''صاحبِ معارف'' کی خدمت میں حاضری کا شرف ملا۔ اس روز کانوں نے جو کچھ سنا اور دل نے جو کچھ قبول کیا اس کا خلاصہ خود حضرت سیدی و مولائی علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ العالی کی زبان حقیقت ترجمان میں یہ تھا ؎

ہم ایسے رہے یاں کہ ویسے رہے وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے
حیاتِ دو روزہ کا کیا عیش و غم سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے
یہ اسباب ہیں دستِ قدرت میں یوں قلم دستِ کاتب میں جیسے رہے

کن الفاظ میں اُس اثر کا اظہار کروں جو قلب پر ہوگیا۔

ادھر کہتا گیا وہ اور ادھر آتا گیا دل میں اثر یہ ہو نہیں سکتا کبھی دعوائے باطل میں [۲]

غرض حضرت سیدی مدظلہٗ العالی کے طفیل اس صحرا نورد کو گلزار اشرفی (تصانیف ومواعظ اشرفیہ) کی سیر میسر آئی اور یہ اسی عطر بیز فضا کا نتیجہ ہے کہ بحمد اللہ اب عمر کی تیسویں منزل پر پہنچ کر دماغ اسلام کی صداقت کا قائل اور دل اس کی معنویت کا گھائل ہے۔ کوتاہی ہے تو عمل کی ہے، حق تعالیٰ اس کمی کو پورا فرما دیں کہ بازار آخرت میں نفع دینے والی یہی ''جنسِ عمل'' ہے۔

چونکہ اپنے اس انقلاب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ قدس سرہٗ کے مواعظ وتصانیف کا بھی ایک خاص حصہ رہا ہے اور آج بھی وہ اصلاح وتقویت عمل کا موجب ہیں۔ اس لئے خیال ہوا کہ اور انگریزی داں اصحاب تک بھی یہ سلسبیل پہنچائی جائے جس کے نہ پہنچنے سے ہزاروں دل ودماغ کی کھیتیاں خشک ومردہ ہیں۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف نے محسوس

---

[۱] تفصیل کیلئے دیکھو باب آثار علمیہ
[۲] یہ شعر خود حضرت سیدی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ قدس سرہٗ کے دلنشیں و پر اثر انداز بیان پر کہا ہے۔

کیا کہ صرف زبان کی قدامت کے باعث بہت سے اس فیض سے محروم ہیں ورنہ یہ مئے وہ مئے نہیں جو ایک بار منہ کو لگنے پر عمر بھر چھوٹ سکے۔ چنانچہ سیدی و مرشدی مدظلہ العالی کی اجازت سے حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کے ایک وعظ الدنیا والآخرۃ کی تسہیل کی جرأت کی۔

الحمد للہ کہ اس کوشش نے "خاطر سلیمانی" میں اطمینان کا مقام پایا اب طباعت و اشاعت کے لئے مسودہ ناشر کے ہاں جا چکا تھا کہ حیدر آباد دکن کی قسمت نے پلٹا کھایا اور آن کی آن میں وہ کچھ ہو گیا جو وہم و گمان سے باہر تھا۔ عزت و عظمت، ذلت و نکبت سے بدل گئی اور جس دورِ حشمت پر اہل دکن نازاں تھے **تلک الایام نداولھا بین الناس** کے قانون نے اس فخر کو ان سے چھین لیا۔ اس انقلاب نے ناشر کو اور خود راقم کو کراچی آنے پر مجبور کر دیا، شکر ہے کہ وعظ کا مسودہ جو ایک ہی تھا ناشر کے ساتھ محفوظ رہا اب جب یہاں اس کی اشاعت کا وقت آیا تو جناب ناشر (مالک نفیس اکیڈیمی) نے مشورۃً کہا کہ اس وعظ کے ساتھ اگر صاحبِ وعظ کی حیات بھی نو تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے آجائے تو زیادہ نفع کی امید ہے۔

مشورہ بہت نیک، لیکن کام ہمت کا طالب اور اہلِ رائے کی اجازت کا خواہاں تھا، حضرت سیدی مدفیوضہٗ تو عازم حج ہو چکے تھے، اتفاقاً ایک روز اس کا ذکر اپنے محترم صائب رائے دوست مولوی نور احمد صاحب اکیابی (خلیفہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ) کے سامنے آیا، موصوف نے ہمت بندھائی بلکہ عجلت کا مشورہ دیا کہ "بہشتی زیور" کے ساتھ بھی اس کو شریک کیا جا سکے لیکن پھر بھی کھٹک باقی تھی، آخر اپنے خیال اور دوست محترم کی تائید کو حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہٗ کہ خدمت میں پیش کیا اور جب یہاں سے بھی ہمت افزائی ہوئی تو توکلاً علی اللہ کام شروع کر دیا، ارادہ تو یہ تھا کہ ۶۰، ۷۰ صفحوں میں اس کو تمام کیا جائے، تا کہ مقدمہ کے طور پر شریک رہے۔ لیکن جب لکھنے لگا تو تائید غیبی اور وسعتِ مضامین کے تقاضے سے یہ ایک مستقل تالیف ہو گئی۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حضرت کے ایک خلیفۂ خاص خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب (بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی، علیگڑھ) حضرت ہی کی حیات میں بعنوان

''اشرف السوانح'' بڑے سائز کے ۸۶۸ صفحات میں تحریر فرما چکے تھے اور پھر حضرتِ شیخ کے وصال پر اس کا تتمہ (۱۴۱) صفحوں پر ختم فرمایا تھا، اس قدر ضخیم ذخیرہ کو اپنے انداز میں چھوٹے سائز کے ڈھائی تین سو صفحات میں لے آنا بڑا ہی ہمت شکن کام تھا لیکن بحمد للہ جیسا کچھ ہو سکا ہدیۂ ناظرین ہے۔

حکیم الامت کی اس مختصر سوانح کے بیشتر اجزاء تو ''اشرف السوانح'' ہی سے ماخوذ ہیں۔ البتہ آثارِ علمیہ کا پورا باب حضرت سیدی و مرشدی دامت برکاتہم کے مضمون ''حکیم الامت کے آثارِ علمیہ'' کی نقل ہے۔ اور اس تالیف کی گویا جان ہے اور امتیاز بھی، ''مسلک اشرفیہ'' کے باب میں پروفیسر مولانا عبد الباری صاحب مدظلہٗ کی کتاب ''تجدید و سلوک'' سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اس کے علاوہ خود حضرت صاحب سوانح قدس سرہٗ کے مواعظ اور آپ کی تصانیف بھی پیش نظر رہی ہیں۔ پھر اس ساری احتیاط کے باوجود اس کو مفتی صاحب مدظلہٗ کی نگاہ تنقید سے گزارا گیا ہے اور حضرت سیدی و سندی دامت فیوضہم نے بھی اس کو شرفِ نظر بخشا ہے۔

اس تالیف کی طباعت و اشاعت میں اپنی کوشش کے باوجود کافی تاخیر ہوگئی۔ لیکن اس کی مصلحت اب یوں ظاہر ہوئی کہ وہم و گمان کے خلاف حضرت مولانا عبد الباری صاحب ندوی مدظلہٗ یہاں تشریف لائے۔ موصوف نے کتاب کا مسودہ حرف بحرف پڑھا اور اس پر ایک ''پیش لفظ'' لکھ کر ممنون فرمایا۔

چند برس پہلے جب ''قائدِ ملت (سوانح بہادر یار جنگ مرحوم) کی تالیف ہوسکی تھی تو یقین نہ آتا تھا کہ اس کو مقبولیت کا شرف بھی ملے گا، لیکن آج جب کہ اپنا یہ گمان غلط ثابت ہو چکا ہے تو اب حق تعالیٰ کے اس برگزیدہ بندہ ''مجددِ ملّت'' حکیم الامت قدس سرہٗ کی سوانح حیات کو پیش کرتے وقت دل اس ذرہ نواز کے لطف و کرم سے پر امید ہے۔

می تو اند کہ دہد اشک مرا حسن قبول
آنکہ دُر ساختہ است قطرۂ بارانی را

فقط: امیدوارِ رحمت غلام محمد عفی عنہٗ
۱۸ رجب ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۵ اپریل ۱۹۵۱ء

بابِ اول

از طلوع تا غروب

بسم اللہ الرحمن الرحیم
حامداً و نصلیاً

نسب اور خاندان

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکمرانی سے قبل راجہ بھیم نے ضلع مظفر نگر میں ایک قصبہ اپنے نام سے ''تھانہ بھیم'' بسایا تھا۔ پھر مسلمانوں کی آمد وسکونت پر اس کا نام ''محمد پور'' ہوا۔ مگر یہ نام مشہور نہ ہوا۔ اور وہی پرانا نام معروف رہا۔ البتہ ''تھانہ بھیم'' سے تھانہ بھون ہوگیا۔ یہ قصبہ اپنی مردم خیزی میں مشہور چلا آ رہا ہے۔ اور یہاں کے مسلمان شرفاء اہلِ شوکت وقوت اور صاحبِ فضل وکمال رہے ہیں۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہٗ کے اجداد نے آج سے صدیوں پہلے قصبہ ''تھانہ بھون'' میں طرح اقامت ڈالی تھی۔ ددھیال کے اجداد تھانیسر ضلع کرنال سے نقل سکونت کر کے یہاں آئے تھے اور نسباً ''فاروقی'' تھے اور ننھیال کے اجداد جھنجھانہ سے تھانہ بھون منتقل ہوئے تھے اور ''علوی'' تھے۔

حکیم الامت کے والد ماجد عبد الحق صاحب مرحوم ایک مقتدر رئیس صاحب نقد و جائداد اور کشادہ دست انسان تھے۔ میرٹھ کی ایک بڑی ریاست کے مختار عام تھے۔ اور بہ اجازت رئیس کمسریٹ کے ٹھیکے بھی لیا کرتے تھے' فارسی میں اعلیٰ استعداد رکھتے تھے۔ اور گو حافظِ قرآن نہ تھے مگر ناظرہ بہت قوی تھا۔ اور قرآن مجید بہت صحت سے پڑھتے تھے۔ ذہنی اعتبار سے بڑے ہی فریس تھے، جس کا ایک کھلا ثبوت یہ ہے کہ اپنے صاحبزادوں کی استعداد وصلاحیت اور افتادِ طبع کو بچپن ہی سے تاڑ گئے تھے اور اسی بناء پر حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کو عربی و دینیات اور چھوٹے صاحبزادے اکبر علی مرحوم کو انگریزی و علوم دنیوی میں لگا رکھا تھا۔ اور اس تفریقِ تعلیم پر ان کو اس درجہ اعتماد تھا کہ ایک مرتبہ

جب ان کی بھاوج صاحبہ نے کہا "بھائی تم نے چھوٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے وہ خیر کما کھائے گا۔ بڑا عربی پڑھ رہا ہے۔ وہ کہاں سے کھائے گا اور اس کا گزارہ کس طرح ہوگا؟ جائداد تو دو میں تقسیم ہو کر گزارے کے قابل نہ رہے گی۔" تو مرحوم پورے یقین کے ساتھ اور جوش سے کہہ اٹھے "بھابی صاحبہ! آپ کہتی ہیں کہ عربی پڑھ کر کھائے گا کہاں سے؟ خدا کی قسم جس کو آپ کمانے والا سمجھتی ہیں اس جیسے اس کی جوتیوں سے لگے لگے پھریں گے اور یہ ان کی طرف رخ بھی نہ کرے گا۔" یہی وجہ تھی کہ اکبر علی مرحوم سے کہیں زیادہ حکیم الامت ہی پر روپیہ صرف کرتے تھے اور کہتے تھے مجھے اس پر (حکیم الامت) رحم آتا ہے، وہ جو کچھ مجھ سے لیتا ہے میری زندگی ہی تک ہے، میرے بعد یاد رکھو کہ وہ میرے مال و متاع سے بالکل علیحدہ رہے گا، کس بلا کی فراست ہے، اور مزاج شناسی! اگر مرحوم کچھ اور ہوتے تو ان کی یہی باتیں کرامات کہلاتیں۔ کیونکہ ان کا ہر قیاس آئندہ زندگی میں حقیقت بن کر جلوہ نما ہوا۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ بھی بڑی ذہین اور صاحبِ نسبت بی بی تھیں آپ کے ماموں پیر جی امداد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک صاحب حال و قال بزرگ تھے۔ یہ اپنے وقت کے مجذوبِ کامل حافظ غلام مرتضیٰ صاحب پانی پتی کے مشورہ سے حیدر آباد دکن تشریف لائے۔ یہاں ملازم بھی ہوئے اور بعد کو حضرت مجذوب ہی کے ایما سے مرزا سردار بیگ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ارادت میں داخل ہوئے جنہوں نے نوابی و جاگیرداری کو ٹھکرا کر فقر و درویشی اختیار کر لی تھی۔ گو حکیم الامت کو مسائل و حقائق میں اپنے ماموں سے اختلاف تھا مگر ان کا جذبۂ عشق بہر حال قابلِ قدر تھا، یہ ان کے عشق شعلہ بار ہی کا اثر تھا کہ بقول حکیم الامت۔ "ان کے اشعار سے آگ برستی تھی"۔ چنانچہ خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا یہ شعر بارہا نقل کیا ہے۔

ساقی ترا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا
جب تو نے یہ مئے ظالم شیشے میں بھری ہوگی

آپ کے نانا میر نجابت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اعلیٰ درجہ کے فارسی داں، انشاء پرداز لطیفہ گو، بزلہ سنج اور حاضر جواب بزرگ تھے۔ مولانا شاہ نیاز احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خلیفہء خاص کے مرید تھے۔ اور حافظ غلام مرتضیٰ صاحب پانی پتی سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔

آپ کے جد اعلیٰ سلطان شہاب الدین علی ''فرخ شاہ'' کابلی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جن کی اولاد میں متعدد علمائے حقانی اور صوفیائے ربانی ہوئے ہیں۔ حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ جلاد الدین تھانیسری، اور شیخ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اسی سلسلۂ ذہب کی چند کڑیاں ہیں۔ خود حضرت فرخ شاہ پہلے تو والی کابل رہے اور سلطنت غزنویہ کے زوال پر جذبۂ جہاد کے ماتحت کئی بار ہندوستان پر حملہ کر کے کافروں کو زیر کیا اور بامراد لوٹے۔ پھر اس ''جہاد اصغر'' سے فارغ ہو کر ''جہادِ اکبر'' میں مصروف ہوئے۔ **رجعنا من الجهاد الاصغر الى جهاد الاكبر** ۔ کابل کے کوہسار کو اپنا نشیمن بنایا بزرگان چشت کے آگے زانوئے ارادت تہہ کر کے مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ اور ایک عالم کو فیض یاب کیا اور پھر بعد وفات وہیں دفن ہوئے۔ یہ موضع آج تک درۂ ''فرخ شاہ'' کے نام سے مشہور اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

ولادت اور بچپن

خاندانِ اشرف کی عظمت کا اندازہ ہو چکا، اب دیکھئے کہ ایسے عالی رحمۃ اللہ علیہ خانوادہ میں جہاں دولت و حشمت اور زہد و تقویٰ بغلگیر ہوتے تھے حکیم الامت کی جامع شخصیت ظہور فرما ہوتی ہے۔

ولادت کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ آپ کے والد مرحوم کی اولادِ نرینہ زندہ نہ رہتی تھی، اس کی ظاہر وجہ یہ تھی کہ موصوف کو جب مرض خارش نے آ گھیرا اور کسی صورت سے دفع نہ ہوتا تھا تو مجبوراً کسی ڈاکٹر کے مشورہ سے ایسی دوا کھالی تھی جو دافع خارش مگر قاطع نسل بھی تھی۔ خارش تو جاتی رہی لیکن بظاہر بقائے نسل کے امکانات بھی دور ہو گئے۔ بات کب تک چھپی رہتی، خوش دامن صاحبہ کو اس کا پتہ لگا تو وہ سخت پریشان ہو گئیں۔ اور حافظ غلام مرتضیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پانی پتی سے عرض کی۔ "میری لڑکی کے لڑکے زندہ نہیں رہتے ہیں۔" حافظ صاحب کا معاملہ تو یہ تھا۔

"قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید"

فوراً مجذوبانہ انداز میں فرمایا۔ "عمر رضی اللہ عنہ و علی رضی اللہ عنہ کی کشاکش میں مر جاتے ہیں اب کی باری علی رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دینا۔" اس معمہ کو کوئی پوچھ نہ سکا۔ لیکن حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ کے ذہن رسا نے اس کے راز کو پالیا۔ وہ کہہ اٹھیں حافظ صاحب کا یہ مطلب ہے کہ لڑکوں کی ددھیال ہے فاروقیؓ اور ننھیال ہے علویؓ اور اب تک جو نام بھی رکھے گئے وہ ددھیالی طرز پر تھے، اب کی بار جب لڑکا ہو تو ننھیالی وزن پر نام رکھا جائے، جس کے آخر میں "علی" ہو۔ حافظ صاحب یہ سن کر ہنس پڑے اور فرمایا "لڑکی بڑی ہشیار ہے میرا منشا یہی تھا۔" پھر فرمایا اور بڑے جوش سے فرمایا۔ "انشاء اللہ اس کے دو لڑکے ہوں گے اور

زندہ رہیں گے۔ ایک کا نام اشرف علی رکھنا اور دوسرے کا اکبر علی۔ ایک میرا ہوگا اور وہ مولوی ہوگا۔ دوسرا دنیا دار ہوگا۔" چنانچہ اس مرد درویش نے جو کچھ تو کلاً علی اللہ کہا تھا، حرف حرف پورا ہوا، اور کیوں نہ ہوتا:

گفتہ او گفتہ اللہ بود!
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

چنانچہ ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو چہار شنبہ کے دن صبح صادق کے ساتھ مجذوب کامل کی پیشن گوئی پیکر اشرف بن کر جلوہ نما ہوئی۔ خوش نصیب تھی وہ صبح جس کے پہلو سے یہ مہر درخشاں نکل آیا۔

تاریخِ پیدائش کرم عظیم بھی کسی نے خوب نکالی ہے۔

ولادت کے چودہ ۱۴ ہی مہینے بعد حضرت حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری پیشن گوئی بھی پوری ہوئی اور نو مولود کا نام اکبر علی رکھا گیا۔ چونکہ دو بچوں کے لئے ماں کا دودھ کافی نہ تھا، اس لئے حکیم الامت کے لئے ایک انّا رکھی گئی ابھی عمر شریف نے شاید پانچ ہی منزلیں طے کی تھیں کہ مادری شفقت کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مگر شفقت پدری نے محبتِ مادری کا کام بھی انجام دیا چنانچہ آپ کے والد ماجد نے آپ کی حفاظت و تربیت بڑے ہی پیار اور محبت سے کی اور اسکا خاص خیال رکھا کہ غیرت و عزت نفس کے جواہر پر گرد نہ آنے پائے، تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر جب مٹھائی بٹتی تو اس میں اپنے فرزند کو ہرگز شریک نہ ہونے دیتے بلکہ خود بازار سے لاکر آپ کو جی بھر کھلا دیتے کہ دل میں طمع نہ رہے اور سمجھاتے کہ مسجد کی مٹھائی لینا بے غیرتی کی بات ہے۔ ادھر یہ رعایت و نرمی تھی دوسری طرف اس پر بھی پوری نگرانی تھی کہ کہیں لاڈ پیار سے بچہ میں گستاخی و بے ادبی پیدا نہ ہو جائے۔ چنانچہ نو عمری میں ایک مرتبہ فرزند کی زبان سے مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مہتمم اول دار العلوم دیوبند) کے متعلق یہ جملہ نکلا کہ "مولانا تو پڑھے ہوئے نہیں ہیں"، تو اس پر اس سختی سے ڈانٹا کہ گویا مارنا ہی باقی تھا۔ اور خوب جتایا کہ بزرگوں کی شان میں

یوں نہیں کہا کرتے ہیں۔ غرض اس صحیح تربیت سے خداداد صلاحیتیں خوب ابھریں اور نکھر گئیں۔

خود طبیعت کا یہ حال تھا کہ بازاری لڑکوں کے ساتھ کھیل کود اور میل جول سے کبھی مناسبت نہ ہوئی اور اس کا باعث وہ ''دینی مذاق'' تھا جو فطرتاً آپ کے اندر موجود تھا۔ یہ نہیں کہ آپ کھیل کود جانتے ہی نہ تھے مگر ہاں آپ کا رنگ یہاں بھی نرالا تھا۔ کھیلوں میں نماز باجماعت کی نقل اتارتے، بازار کی طرف نکل جاتے اور راستے میں مسجد پر نظر پڑتی تو سیدھے اندر چلے جاتے اور ممبر پر چڑھ کر کچھ پڑھ پڑھا کر لوٹ آتے۔ گویا مستقبل کا خاکہ اس نیم شعوری دور ہی سے کھینچ رہے تھے۔ آپ کے مزاج میں شوخی بھی تھی اور اس نے ذہانت سے مل کر عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی ایک ہی واقعہ سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے، ایک نابینا حافظ قرآن تھے اور ان کو کلامِ مجید خوب یاد تھا اور اس پر ان کو ناز بھی تھا۔ حکیم الامت کی نوعمری تھی ابھی ابھی حفظ قرآن سے فارغ ہوئے تھے اور نابالغ ہونے کی وجہ سے نوافل میں قرآن پاک سنایا کرتے تھے، ایک دن حافظ جی سے فرمایا کہ آج آپ کو دھوکہ دونگا اور یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ فلاں آیت میں دھوکا دونگا، حافظ جی نے بر بنائے ناز کہا۔ ''جاؤ بھئی تم کیا مجھے دھوکہ دو گے بڑے بڑے حافظ نہ دے سکے!'' غرض جب آپ سنانے کھڑے ہوئے اور اس آیت پر پہنچے **انما انت منذر ولکل قوم هاد** تو بہت ترتیل کے ساتھ پڑھا جیسا کہ رکوع کرنے کے قریب پڑھا کرتے ہیں۔ اس کے بعد جب اس سے آگے **الله يعلم**، الخ پڑھنے لگے تو لفظ ''اللہ'' کو اس طرح کھینچ کر پڑھا گویا اب رکوع کریں گے، اور گویا ''اللہ اکبر'' کہنے والے ہیں۔ بس حافظ جی اسی تصور سے فوراً رکوع میں چلے گئے۔ ادھر آپ نے آگے قرات شروع کر دی **يعلم ما تحمل**، الخ حافظ جی لاچار پھر کھڑے ہو گئے اور آپ بے قابو ہو کر زور سے ہنس پڑے اور نماز توڑ کر الگ ہو گئے اور جب خوب ہنس چکے تو دوبارہ نیت باندھ لی۔

اس شوخی کے ساتھ طبیعت کی سنجیدگی اور اس نوعمری میں آثار پختگی ملاحظہ ہوں۔

ابھی ۱۲۔۱۳ برس کی عمر ہو گی کہ 'فغان صبح گاہی'' کی لذت سے آشنا ہو گئے پچھلی رات سے

اٹھ بیٹھتے۔ تہجد و ظائف میں محو ہو جاتے تھے، معصومیت کی یہ نیاز مندیاں کیا کچھ اثر نہ پیدا کر گئی ہوں گی۔ والدہ تو تھیں نہیں، تائی صاحبہ بچاری بہت بیتاب ہوتیں اور سمجھاتیں کہ اس نوعمری میں ان مشقتوں کی کیا حاجت ہے۔ لیکن جس کے مجمرِ قلب میں عشق کی آگ بھڑک چکی تھی وہ کیسے بجھ سکتی تھی، خصوصاً جب کہ صحبت و شاگردی تھی تو مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسے آتش بجان اور شعلہ سامان بزرگ کی! ع

ہر چہ گیر دعلتی علت شود!

حکیم الامت میں لطافت طبع اس درجہ کی تھی کہ بچپن کے تقریباً لاشعوری دور میں بھی کسی کا برہنہ پیٹ دیکھ لیتے تو فوراً قے ہو جاتی تھی، اس لطافت طبع کے باعث بہت ستائے گئے اور ہم عمروں نے بہت دق کیا۔ یہ تو بچپن تھا، بڑے ہو کر یہ حال تھا کہ جس کمرہ میں تیز خوشبو ہوتی تو سو نہ سکتے تھے، کسی کا جھوٹا کھانا تقریباً ناممکن تھا۔ چنانچہ باوجود انتہائی عقیدت و محبت کے عمر بھر کبھی اپنے بزرگوں کا جھوٹا نہیں کھایا۔ مزاج میں اصول پسندی اس درجہ کی تھی کہ آپ کی بڑی اہلیہ محترمہ فرمایا کرتی تھیں: ''آپ تو کسی بادشاہ کے ہاں پیدا ہوتے!''

مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ محدث جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی اور اپنے شیخ کے خلیفہ ارشد تھے۔ حکیم الامت کے بچپن ہی کے احوال و آثار سے آپ کے مستقبل کا اندازہ لگا چکے تھے اور فرماتے تھے، ''میرے بعد یہ لڑکا میری جگہ ہوگا۔''

اسی لڑکپن کے زمانہ میں حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خواب دیکھا، جس کو ذہن نے پہلی بار محفوظ کیا، کہ بڑے مکان میں ایک پنجرہ رکھا ہوا ہے۔ اس میں دو خوبصورت کبوتر ہیں، جب شام ہوئی اور تاریکی چھا گئی تو ان کبوتروں نے آپ سے کہا: ''ہمارے پنجرہ میں روشنی کر دو۔'' آپ نے جواب دیا۔ ''خود ہی کر لو۔'' چنانچہ انہوں نے اپنی چونچیں رگڑیں جس سے ایک تیز روشنی ہوئی اور سارا پنجرہ منور ہو گیا۔

ایک مدت بعد جب آپ نے یہ خواب اپنے ماموں واجد علی مرحوم سے بیان کیا تو انہوں نے تعبیر دی کہ دو کبوتر روح اور نفس تھے۔ انہوں نے تم سے درخواست کی کہ مجاہدہ کر کے ہم کو نورانی کر دو۔ مگر تم نے جو یہ کہہ دیا کہ تم خود ہی روشنی کر لو اور انہوں نے اپنی چونچ رگڑ کر روشنی کر لی، اس کا یہ مطلب ہے کہ انشاء اللہ بلا ریاضت ہی حق تعالیٰ تمہاری روح اور نفس کو نورِ عرفاں سے منور فرما دیں گے۔ آئندہ اوراق بتائیں گے کہ یہ رویاء شاہدِ فطرت کا ایک اشارہ تھا کہ ہم نے اس ہونہار کو چن لیا اور برگزیدہ کر دیا۔ اہلِ بصیرت سے یہ بات چھپی نہیں کہ گو طریق ولایت کسبی و اختیاری ہے مگر منصب ولایت محض وہبی ہے[1]

اللہ یجتبی الیہ من یشاء ، الخ۔۔۔ بقول سیدی مدظلہٗ ؎

انہی کے دینے سے ملتا ہے جس کو ملتا ہے
وہی نہ چاہیں تو کوشش کوئی ہزار کرے

---

[1] طریق اجتباء و طریق انابت

اللہ یجتبی الیہ من یشاء و یھدی الیہ من ینیب (اللہ جس کو چاہتا ہے اپنا برگزیدہ بنا لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اس کو اپنا راستہ دکھاتا ہے)، اسی آیت سے صوفیائے کرام نے طئے سلوک کے دو طریقے بتائے ہیں (۱) ''طریق اجتباء'' (۲) ''طریق انابت'' پہلے طریق میں ''محبوبیت'' کا غلبہ ہے اور دوسرے میں ''محبیت'' کا۔ ''طریق اجتباء'' کے چلنے والے میں سکون و قرار و طمانیت کی شان ہوتی ہے۔ انکسار و شائستگی اور تسلیم و رضا ان کا شعار ہوتا ہے۔ اپنی بیچارگی اور اپنے ہمہ تن خطا وار ہونے کا اس درجہ تصور ہوتا ہے کہ عبادت بھی کرتا ہے تو ندامت و شرمساری غالب رہتی ہے۔ ''طریق انابت'' کے چلنے والے میں ولولہ و شوق، اضطراب و التہاب کا غلبہ ہوتا ہے، اس کی کیفیت تمام تر والہانہ و عاشقانہ ہوتی ہے دنیا سے وحشت عیاں ہوتی ہے۔ اور غلبہ عشق میں اس کی زبان سے بعض ایسے کلمات بھی نکلتے ہیں جو صورۃً خلاف ادب معلوم ہوتے ہیں۔ گو اس کا منشاء سوء ادب نہیں ہوتا۔''

(دیکھو تبریز ترجمہ ''ابریز'' از مولانا عاشق الٰہی رحمۃ اللہ علیہ میرٹھی)

حصولِ علم

حکیم الامت کی ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں یہیں پڑھیں، حافظ حسین علی مرحوم سے کلامِ پاک حفظ کیا، پھر تھانہ بھون آکر مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عربی کی ابتدائی اور فارسی کی متوسط کتابیں پڑھیں پھر ماموں واجد علی صاحب مرحوم سے جو ادب وفارسی کے استاد کامل تھے، فارسی کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد دیوبند پہنچ کر بقیہ نصاب کی تکمیل منفعت علی صاحب سے کی اور اس زبان پر پورا عبور حاصل کیا۔

قیام دیوبند ہی کے زمانے میں ایک مرتبہ خارش میں مبتلا ہو کر گھر تشریف لائے اور بطور مشغلۂ فرصت ایک مثنوی ''زیروبم'' لکھی جس سے آپ کی اس زبان میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۸ برس سے زیادہ نہ تھی۔ مثنوی سے پہلے ایک ''اعتذار'' لکھا ہے جو درج ذیل ہے۔

بعد الحمد والتحیۃ لحقیقہا والصلوٰۃ والسلام علیٰ لیقہما، ہمی گوید گرفتار درونالہ نادان ہشدہ سالہ خاکپارے درویشان وگرد راہ عشق کیشاں، در زاویۂ خمول افتادہ وگرد راہ زانوئے گمنامی نہادہ۔

الفقیر الی اللہ الغنی، العاجز اشرف علی غفر الغفار ذنوبہ دستر الستار عیوبہ کہ ایں نغمہائے چند برانگیختم از سوز نہانی، وایں سوز ہا بیرون افگندم از درد پنہانی۔ ہرچہ در دلم ریختند ریختم و بیختند بیختم، نہ از قافیہ آگاہم نہ از ردیف اطلاعم، نہ از روئے خبر، نہ از وزن بنائے، نہ عروض دانم نہ تقطیع خوانم۔ نہ اعتراضے برمن رود نہ سوالے برمن شود کہ مدعی نیم اعترافِ قصوری کنم، نہ مایہ دارم نہ بضاعتے، نہ سودے نہ تجارتے۔ از

بے زر آید چہ ساز واز بے پر آید چہ پرداز۔ پر و بال شکستہ ام واز بندِ اعتراض و جواب رستہ ام۔ والسلام فقط محررہ ۱۲۹۸ھ

اب اس ہیچدانی اور بے مائیگی کے اعتراف کے بعد علم و عرفان کے جو بیش بہا موتی پیش کئے گئے ہیں اور جس حسن سلیقہ سے ان کو پرویا گیا ہے۔ اس کا اندازہ ایک جوہر شناس ان چند لڑیوں سے لگا سکتا ہے، اصل قصہ بیان کر کے اس کی معنویت کی طرف اب ذہن کو لا رہے ہیں۔

قصۂ ارباب ظاہر ختم شد حصۂ اصحاب باطن ماند خود
اہلِ ظاہر حظِ خود برداشتند حصۂ اہلِ بطون بگذاشتند
نور و عرفاں ساز حاصل اے پسر تو مکن بر قصۂ ظاہر نظر!
ہست باطن گوہر و ظاہر صدف گیر گوہر کن صدف را بر طرف
ظاہر ست انگور باطن ہمچو مل ہست چوں جز ظاہر و باطن چو کل
تا کجا باشی بدیجور ظہور سوئے باطن آوبین اشراق و نور
چوں شدی فارغ ز ظاہر داستاں آبسوئے باطنش سازم بیاں

اس کے بعد مسائل باطن کی گرہیں کھولی ہیں۔ ''مثلاً دیکھئے فنا فی اللہ'' کے مقام کو کس طرح بیان کیا ہے۔

ہمچنیں کوشش نماید در طریق تا کہ در بحر فنا باشد غریق
خویشتن را چوں فنا فی اللہ کند پس شود واصل بآن ذات احد
یسمع بی یبصر بی می شود یبطش بی، ینصر بی می شود
قول او قول الٰہ ذوالجلال فعل او فعل خدائے بے مثال

شرک کے پیدا ہونے کی وجہ معلوم ہے؟ سنئے اس کی علت اصلی یہ ہے۔

غیر راخالق تصور می کند پس ز جہل خویش مشرک می شود
زانکہ در ہر چیز نورش لامع است اندراں نور ایں بشر بس طامع است

نورا واصل ست وعکسش نور شاں　　پس دراصل وعکس نکند فرق آں
عکس راہم اصل بنماید خیال　　پس بیفتد در وبال و در نکال

وغیرہ وغیرہ۔

عربی کی ابتدائی تعلیم، جیسا کہ گذر چکا۔ وطن ہی میں ہوئی تھی۔ پھر آخر ذیقعدہ ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور پانچ سال یہاں مشغول تعلیم رہ کر شروع ۱۳۰۱ھ میں فراغت حاصل کی۔ اس وقت عمر شریف ۱۹، ۲۰ برس کے لگ بھگ تھی۔

طالب علمانہ حیثیت

زمانہ طالب علمی میں عام طلبہ اور عزیز و اقارب سے الگ تھلگ رہے اگر کتابوں سے کچھ فرصت ملتی تو اپنے استاد خاص مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ (مدرس اول دارالعلوم دیوبند) کی خدمت فیض درجت میں جا بیٹھتے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جو ایک طرف علم وفضل میں یگانہ تھے۔ اور دوسری طرف حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کے خلفائے خاص میں سے تھے۔ انکی اس جامعیت کی وجہ سے ان کا حلقہ درس "حلقۂ توجہ" بھی ہوتا تھا، اوراسی ذہن وقلب کی ایک ساتھ تعلیم وتربیت کا نتیجہ تھا کہ طلبہ جب علم میں ایک خاص استعداد کی سند حاصل کر چکتے تو کردار واخلاق اور زہد وتقوی میں بھی امتیازی شان کے حامل ہوتے تھے۔ افسوس کہ آج اکثر وبیشتر دینی درسگاہیں اس جامعیت فیض سے عاری ہیں۔

"قصبۂ دیوبند" میں حکیم الامت کے کچھ رشتہ دار بھی رہتے تھے، انہوں نے اصرار کیا کہ کھانا گھر کا کھایا کریں البتہ رہائش مدرسہ ہی میں ہو۔ آپ نے اپنے والد ماجد صاحب سے اس کی اجازت چاہی تو تربیت کے رمز آشنا والد نے ڈانٹ کر لکھا:

"تم وہاں رشتہ داریاں جتانے گئے ہو یا طالب علمی کرنے؟ خبردار جو کسی عزیز کے پاس آئے گئے۔"

اس تنبیہ کے بعد اس اطاعت شعار فرزند نے پورے ۵ سال تک کسی عزیز کی طرف رخ بھی نہیں کیا اور عام طلباء کی طرح زندگی گزارتے رہے۔ یہاں تک کہ اب اگر کوئی خود ہی میل جول بڑھانا چاہتا تب بھی بے رخی برتتے تھے۔ حتی کہ بعضوں کو غرور کا دھوکہ ہو چلا تھا۔ آپ ابھی طالبِ علم ہی تھے۔ مگر بزرگوں کی دوربیں نگاہیں اس دھند لکے ہی سے روز روشن کا پتہ لگا رہی تھیں۔

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارہ بلندی

چنانچہ جب مولانا رشید احمد گنگوہی (قدس سرہٗ) طلبہ کا امتحان لینے اور ان کو دستارِ فضیلت سے سرفراز کرنے کیلئے تشریف لائے تو شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس شاگرد کی ذکاوت و ذہانت کی بڑی تعریف کی، جناب ممتحن نے مشکل مشکل سوالات کئے اور ان کے برجستہ جواب پاکر مسرور ہوئے۔

آپ کے ذہن کو علوم عقلیہ سے خاص مناسبت تھی، فطرت نے ذہانت و فطانت، حاضر جوابی اور طلاقت لسانی کے جواہر سے پوری طرح آراستہ کیا تھا، منطق میں مہارت کا اعتراف یوں فرماتے تھے:

''میں سچی بات کیوں نہ کہوں کیونکہ نہ میں متواضع ہوں نہ متکبر، جو چیز اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے اس کا کیوں انکار کروں اللہ کی دین ہے۔ میرا کوئی کمال نہیں۔ الحمد للہ مجھے منطق میں مہارت حاصل ہے۔ اور میں درحقیقت اس کو کوئی کمال بھی نہیں سمجھتا کیونکہ بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرنے کی برکت سے یہ اچھی طرح ذہن نشین ہوگیا ہے کہ

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ می نگیر د فضل شاہ

چنانچہ جب کوئی غیر مذہبی شخص اسلام کے خلاف مناظرہ کے لئے دیوبند آتا تو آپ خلوت سے نکل آتے اور مخالف کے ہر دعوے کو باطل ثابت کردکھاتے۔ مگر تعریف کی بات تو یہ ہے کہ آپ نے اپنی ساری منطقی صلاحیت حمایت دین ہی میں صرف کی اور کبھی اس کو بقائے نفس کے لئے استعمال نہیں فرمایا۔ اس وقت کے مناظروں کے سرتاج مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب، آپ کی فن دانی کے متعلق فرماتے تھے:

''بڑے سے بڑا مناظر بھی آپ کے آگے ٹھہر نہیں سکتا۔''

لیکن خود حکیم الامت یہ فرماتے تھے: ''جتنا شوق مجھے اس زمانۂ طالب علمی میں مناظرہ کا تھا اب اس کی مضرتوں کی وجہ سے اتنی ہی نفرت ہے۔''

ادھر علوم عقلیہ ونقلیہ میں مہارت کا یہ عالم کہ اہلِ فن اس کے مداح اور ادھر تواضع اس درجہ کہ یہ باور کرنا دشوار ہوجاتا ہے کہ آیا نفس موجود بھی تھا؟ ۱۳۰۰ھ کا واقعہ ہے، خبر ملی کہ دستار بندی وتقسیم اسناد کا جلسہ بڑے شاندار پیمانے پر ہونے والا ہے، اور یہ رسم مولانا گنگوہی قدس سرہٗ کے مقدس ہاتھوں انجام پانے والی ہے۔ اپنے ہم سبقوں کو جمع کر کے استاذ خاص مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کی:

''حضرت ہم نے سنا ہے کہ ہم لوگوں کی دستار بندی ہوگی، اور سند فراغ دی جائے گی، حالانکہ ہم ہرگز اس کے اہل نہیں، یہ تجویز منسوخ فرمادیجئے۔ ورنہ اس میں مدرسہ کی بڑی بدنامی ہوگی کہ ایسے نالائقوں کو سند دی گئی ہے۔''

استاد کی شفقت کو جوش آیا، ان کی آنکھوں کے آگے ''شاگردِ خاص'' کا مستقبل بجلی کی طرح چمک کر گذر گیا، یقین کی کیفیت الفاظ میں ڈھل کر نکل آئی:

''تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے، یہاں چونکہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں اس لئے انکے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نظر نہیں آتی اور ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ باہر جاؤ گے تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی۔ جہاں جاؤ گے بس تم ہی تم ہوگے باقی سارا میدان صاف ہے۔''

دنیا نے دیکھ لیا کہ استاد باکمال کی یہ بشارت حرف حرف صحیح نکلی مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فتوی نویسی کا کام بھی اسی زمانہ میں آپ کے سپرد فرمایا تھا۔ ایک مرتبہ جب نومشق مفتی نے ایک طویل استفتاء کا ویسا ہی مفصل ومکمل جواب لکھ کر اپنے استاذ کی خدمت میں پیش کیا تو عارف کامل استاذ نے اس پر دستخط کرتے ہوئے فرمایا:

''معلوم ہوتا ہے کہ تم کو فرصت بہت ہے، ہم تو اس وقت دیکھیں گے جب خطوں کا ڈھیر تمہارے سامنے ہوگا اور پھر تم اتنے لمبے لمبے جواب لکھو گے۔''

آئندہ پتہ چلے گا کہ بصیرت یعقوبی کا یہ اشارا کس قدر صحیح تھا۔

حق تعالیٰ کی بخشش کا ہاتھ جس پر کھل جائے۔ اور جس قدر کھل جائے اس کو کون روک سکتا ہے۔ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کو جہاں اور محاسن ظاہری سے نوازا گیا تھا وہاں خوش الحانی سے بھی پوری طرح سرفراز کیا گیا تھا۔ آپ کی فن قرأت میں مہارت کے

ساتھ حسن صورت نے مل کر ایک عجیب دلآویزی پیدا کر دی تھی۔آپ نے قرأت کی مشق مشہور عالم قاری محمد عبداللہ صاحب مہاجر مکی سے مکہ معظمہ میں کی، جو عرب کے قاریوں پر بھی اپنے مہارت فن کا سکہ جما چکے تھے، حکیم الامت کی قوت آخذہ کا یہ عالم تھا کہ جب اوپر والی منزل پر شاگرد واستاذ مشق کرتے کراتے ہوتے تو رہرو کیلئے پہچاننا مشکل ہو جاتا کہ استاد کون ہے اور شاگرد کون؟ حکیم الامت جب قرآن پڑھتے تو حق تعالیٰ کی اس ''تجلی لفظی'' کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ جس کی بنا پر کفار مکہ حضرت صدیق اکبر کو باآواز بلند قرآن پڑھنے سے روکتے تھے، اور جس کی وجہ سے لوگوں کا دل خواہ مخواہ کلام اللہ کی طرف کھنچتا اور حق کی تلوار کا گھائل ہوتا تھا۔ مولانا عین القضاۃ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے ماہر فن نے جب ایک مرتبہ آپ کے پیچھے نماز فجر پڑھی تو اس درجہ متاثر ہوئے کہ بعد نماز بہت اشتیاق سے کچھ اور سامعہ نوازی کی خواہش ظاہر کی۔

آپ کی اثر پذیر طبیعت کا یہ حال تھا کہ دار العلوم کی حقیقت پرور فضا سے بہت جلد متاثر ہو گئے۔ امیرانہ تکلفات ختم کر دیئے۔ فضولیات سے خود کو الگ کر لیا اور سادہ سی زندگی فقیرانہ روش اختیار فرمالی۔ ایک مرتبہ چھٹیوں میں گھر آئے اور اب جیسا کہ رنگ ڈھنگ ہو چکا تھا، بلا کسی اہتمام کے یونہی رضائی لپیٹ رکھی تھی۔ والد ماجد نے جو امیرانہ انداز کے خوگر تھے ٹوکا کہ ''میاں تمہیں رضائی اوڑھنا بھی نہیں آتا؟''

خاطر اشرف میں ان فضولیات سے اس درجہ نفرت بیٹھ چکی تھی کہ باوجود سارے ادب واحترام کے بے ساختہ کہہ اٹھے کہ ''اگر آپ کو رضائی اوڑھنا سکھانا تھا تو مجھے مدرسہ دیوبند نہ بھیجتے وہاں تو کسی کو بھی رضائی اوڑھنا نہیں آتا۔ سب ایسے ہی اول جول رہتے ہیں۔''

والد یہ جواب سن کر دل میں خوش ہوئے۔

حکیم الامت طلبہ کے بناؤ سنگھار اور ان کے ادنیٰ چیزوں پر التفات سے بہت نفرت کرتے تھے۔ اور اس کی کس قدر حکیمانہ وجہ بتائی ہے۔

''یہ بناؤ سنگھار'' اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو علم کا چسکا نہیں لگا۔''

اِفادہ علمی

تکمیل تعلیم کے بعد اب وقت آتا ہے کہ دارالعلوم سے جو فیوض حاصل کئے تھے اور استاد خاص کی توجہات نے جو علمی و عملی جامعیت پیدا کر دی تھی، مدرسہ سے نکل کر اسی فیض اور اسی رنگ کو عام کیا جائے۔

سبزہ کا آغاز ہے۔ جمال ظاہری اور کمال باطنی سے آراستہ ہیں، اشاعت دین کے جذبہ سے معمور اور زیور علم سے آراستہ ہیں۔ خود ذات میں بلا کی کشش ہے اور جب زبان فیض ترجمان کھلتی ہے تو پھر اثر اور نفوذ کا کیا پوچھنا۔ جس جگہ بیٹھ گئے عامی و عالم، مسٹر و ملا سب ہی گھر آئے اور اس نوجوان کے گوناگوں کمالات کے قائل ہو گئے۔

اس مقبولیت و احترام کے ساتھ آپ چودہ برس تک کانپور میں درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور وعظ گوئی و فتویٰ نویسی کا کام کرتے رہے اور دیدہ ور استاد کی پیشن گوئی حرف حرف صحیح نکلی کہ ''جہاں جاؤ گے بس تم ہی تم ہو گے، باقی سارا میدان صاف!!''

کانپور میں ایک مدرسہ قدیم سے چلا آ رہا تھا اور ''مدرسہ فیض عام'' کے نام سے مشہور تھا، اس کے صدر مدرس مولانا احمد حسن صاحب، ایک جامع اور خصوصاً ماہر معقولات عالم تھے۔ کسی وجہ سے ناراض ہو کر موصوف نے الگ مدرسہ قائم کیا۔ چونکہ طلباء میں ان کے وقارِ علمی کا سکہ بیٹھا ہوا تھا اس لئے کسی مدرس کو ان کی جانشینی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ حکیم الامت کو اس حال کی خبر نہ تھی، جب کانپور والوں نے یہ خدمت آپ کیلئے پیش کی تو آپ نے اساتذہ اور والد ماجد کی اجازت سے صفر ۱۳۰۱ھ میں (پچیس روپیہ) ماہوار پر یہاں تشریف لے آئے۔ جوان عمر تھے لیکن بہت جلد وہاں کے سارے مدرسین میں آپ کے علم و فضل کا شہرہ ہو گیا۔ خود سابق صدر مدرس بھی آپ سے محبت کرنے لگے۔

حکیم الامت اس سے پہلے کبھی مسند تدریس پر نہ بیٹھے تھے اور یہاں جو پہنچے تو اونچے درجہ کی کتابیں آپ کے سپرد ہوئیں۔ پہلے پہل طبیعت کچھ گھبرائی، لیکن دعاؤں نے سارے مراحل طے کرادیئے اور غیب سے آپ کی ہمت افزائی ہونے لگی۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:

''احقر نے جب حدیث کا درس شروع کیا تو استاذی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت سے اس طرح مشرف ہوا کہ میرے روبرو ایک جماعت صحیح بخاری پڑھنے والوں کی موجود ہے اور ایک نسخہ بخاری کا میرے سامنے ہے جس میں دیکھ کر درس دیتا ہوں اور میرے برابر میں حضرت استاذی الممد وح تشریف رکھتے ہیں اور غالباً آپ کے پاس بھی ایک نسخہ بخاری شریف کا ہے اور میں جو بیان کرتا ہوں مولانا اس کی تقریر فرماتے ہیں۔''

اسی طرح تفسیر کلام پاک سے مناسبت کا واقعہ سنئے۔ فرماتے ہیں:

''ایک مقام ہے، جیسے کانپور میں جناب عبدالرحمٰن خاں صاحب بانی مدرسہ جامع العلوم کانپور کا چھوٹا مطبع۔ وہاں کوئیں کے پاس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کھڑے ہیں اور میں قریب ہوں۔ اس کے بعد مجھ کو مناسبت تفسیر کا ظن غالب ہو گیا۔''

اب معلوم ہو گیا کہ قدرت الٰہی خود آپ کے ذریعہ علوم کے دریا بہانا چاہتی تھی، پھر کیا تعجب ہے اگر ایک طرف آپ کے درس و تدریس نے طلبہ کو اور دوسری طرف آپ کی تقریر و وعظ نے اہلِ کانپور کو آپ کا فریفتہ بنا دیا ہو اور یہ سب کچھ کیا کئی برسوں میں ہوا، نہیں صرف تین چار مہینوں میں! اس بندہ نواز کو نوازتے کیا دیر لگتی ہے، صرف اس کی چشمِ کرم کا مائل ہو جانا ہے۔ پھر دیکھئے کہ آن کی آن میں ایک مشت خاک کیا سے کیا ہو جاتی ہے!

مدرسہ کی مجلس تنظیمی نے حکیم الامت کی اس مقبولیت سے مالی فائدہ اٹھانا چاہا اور آپ سے چندہ کی اپیل کی خواہش کی گئی، حکیم الامت اس قسم کے چندوں کو بے برکتی کا موجب اور ان کے لینے کو غیرت دینی کے خلاف اور ناجائز سمجھتے تھے اس لئے اراکین مدرسہ کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، حضرت

نے اس کی اطلاع پا کر از خود استعفا پیش کر دیا اور باوجود اصرار کے پھر اس مدرسہ میں رہنا گوارا نہ فرمایا۔

مدرسہ سے سبکدوش ہو کر ارادہ تو یہ تھا کہ وطن لوٹ جائیں مگر گھر جانے سے پہلے خیال آیا کہ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا جائے۔ نہ جانے پھر کب اس کا موقع ملے۔ چنانچہ آپ خانوادۂ نقشبندیہ کے اس قطب وقت کی خدمت میں پہنچ گئے۔ ادھر کانپور چھوٹا اور ادھر اہلِ کانپور کو اس نقصان عظیم نے مضطرب کر دیا۔ عبدالرحمٰن خاں صاحب اور کفایت اللہ صاحب مرحوم نے اس خیال سے کہ ایسی ہستی جو معقولات و منقولات کی جامع ہو نایاب ہے۔ اپنی طرف سے ۲۵ روپے کی سبیل نکالی۔ اور جب آپ گنج مرادآباد سے گھر لوٹ رہے تھے تو آپ کو کانپور ہی میں روک لیا اور اس درجہ مجبور کیا کہ ماننا ہی پڑا۔ اب آپ جامع مسجد محلّہ ٹپکاپور میں درس دینے لگے اور اس طرح ایک نئے مدرسہ کی بنا پڑی جس کا نام خود آپ نے مسجد کی مناسبت سے ''جامع العلوم'' رکھا۔ جو اب تک قائم ہے۔ سچ ہے ۔

رند جو ظرف اٹھا لے وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لے وہی مئے خانہ بنے

اب تو آپ کی محبت لوگوں کے دلوں میں اس درجہ گھر کر گئی اور ان کے خلوص نے آپ کو اس قدر متاثر کیا کہ آپ کے ذہن میں وطن کی یاد محو ہو گئی۔ دن گذرتے گئے آپ کی تعلیم و تلقین سے سینکڑوں کے ذہن قلب میں تعلیماتِ اسلامی کی عظمت و حقانیت جم گئی اور وہ اتباع سنت میں چست ہو گئے۔ مگر عین اس عالم میں خیال پیدا ہوا کہ اللہ کا کام صرف اللہ ہی کے لئے ہونا چاہئے اس کے لئے معاوضہ لینا کچھ مناسب نہیں۔ چنانچہ ارادہ ہوا کہ طبابت کو ذریعہ معاش بنایا جائے۔ حکیم عبدالمجید خاں صاحب کی خدمت میں پہنچے تاکہ اس فن میں مہارت حاصل ہو۔ لیکن یہاں پندرہ دن بھی رہنے نہ پائے تھے کہ کانپوری حضرات آئے اور اصرار کر کے پھر اپنے وطن لے گئے اور اس بازگشت پر بڑی خوشیاں

منائیں۔

عاد الربیع لروضی بعد ما ذھبا	و عمّر اللّٰہ ربعی بعد ما خربا
(میرے چمن میں بہار جا کر پھر آ گئی	اور خدا نے میرے گھر کو ویرانی کے بعد پھر آباد کردیا)
وزینت الارض خضراً بعد ما یبست	والبرق عاد سناہ بعد ما احتجبا
(زمین خشک ہوکر پھر سرسبز ہوگئی	اور بجلی کی چمک چھپ کر پھر نکلی)
وفجر العلم عیناً بعد ما نضباً	واشرق الفضل شمساً بعد ما غربا[1]
(اور علم کا چشمہ سوکھ کر پھر رواں ہوا	اور علم وفضل کا آفتاب ڈوب کر پھر نکل آیا)

مرشد برحق حضرت حاجی صاحب نے بھی اس واپسی پر بڑی مسرت ظاہر کی، تحریر فرمایا:

"آپ کی طبابت کے شغل کو ترک کر کے پھر کانپور تشریف لا کر دینیات کے شغل کا حال معلوم ہوا، بہت خوشی ہوئی، اللہ جل جلالہٗ آپ کی اس خدمت میں برکت دے کر آپ کے برکات وفیض سے تمام مسلمانوں کو مستفیض ومستفید کرے۔ میں نے قبل ہی آپ کو مشورہ دیا تھا کہ دین کو خوب مضبوط پکڑنا چاہیئے، دنیا خود ہی اچھی صورت میں خدمت کو حاضر رہے گی۔ بہر کیف آپ لوگ علماء ورثۃ الانبیا ہیں آپ لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لئے پیدا کر کے بڑے درجے عنایت کئے ہیں، پس اپنے مقصود کا خیال سب پر مقدم رکھنا چاہئے"۔

(ازمکتوبات امدادیہ نمبر ۳، مؤرخہ ۱۶ ربیع ۱۳۰۶ھ)

شیخ کے ان ارشادات اور ہمت افزائیوں کے بعد آپ نے پورے ۱۴ برس درس و تدریس میں گزار دیئے۔ اور پھر خود شیخ ہی کی ایما سے آخر صفر ۱۳۱۵ھ میں کانپور کا تعلق ترک کر کے تھانہ بھون میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اس مراجعت پر حضرت شیخ نے بڑا اطمینان ظاہر کیا اور گویا آپ کے فیض کے بڑھنے اور پھیلنے کی پیشن گوئی فرمادی، تحریر فرمایا:

"بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ امید ہے کہ خلائق کثیر کو آپ سے فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ ومسجد کو از سر نو آباد کریں۔ میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں۔" (ازمکتوبات امدادیہ نمبر ۳۶، مؤرخہ ۱۲ ربیع ۱۳۱۵ھ)

---

[1] ازمنظومات عربی حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

حکیم الامت کو ابتداء سے لے کر آخر عمر تک طلبہ سے خاص محبت رہی اور ان کا خاص لحاظ فرماتے تھے۔ چنانچہ فرمایا:

''مجھ کو شاگردوں سے جتنی محبت ہے، مریدین و معتقدین سے اتنی نہیں، شاگرد تو اولاد کی طرح ہوتے ہیں شاگردی اور استادی کا تعلق نہایت مستحکم اور پائیدار ہوتا ہے اور عقیدت کا تعلق اکثر ناقابلِ اعتبار۔'' (ملفوظاتِ اسعد الابرار)

خود اپنے آپ کو ہمیشہ طالب علم سمجھتے رہے، فرمایا کرتے:

''مجھے پیرجیوں والی درویشی نہیں آتی، میں تو ایک طالب علم ہوں مجھ سے تو قرآن و حدیث کی باتیں پوچھی جائیں مجھے تو سیدھا سادا قرآن و حدیث ہی آتا ہے اور اسی کو اصل درویشی سمجھتا ہوں۔''

اور یہ بھی فرماتے تھے:

''صوفیا سے زیادہ علماء کی ضرورت ہے کیونکہ انہی کی بدولت انتظام دین قائم ہے۔''

علماء کی اس اہمیت کے پیش نظر آپ کو اس کا بڑا خیال رہتا تھا کہ علم دین سیکھنے والوں کے وقار کی بہر طور حفاظت ہو۔ اور آئندہ ان کو جس منصبِ جلیل پر فائز ہونا ہے اس کے مدنظر ابتدا ہی سے ان کے حوصلوں کو بلند رکھا جائے۔ چنانچہ آپ طلبہ کو ہر اس چیز سے روکتے تھے جس سے ان کا یہ جوہر پائمال ہو، مثلاً قدیم رواج کے مطابق طلبہ کو کبھی کسی کے گھر جا کر کھانا لانے یا کسی کے ہاں فقیروں اور محتاجوں کی طرح دعوت کھانے کی اجازت نہ دیتے تھے، خانگی کام نہ خود لیتے تھے اور نہ کسی اور استاذ کو اس کی اجازت تھی، کسی غیر شخص کی مجال نہ تھی کہ طلبہ کو کسی غلطی پر براست تنبیہ کر سکے، اگر کوئی شخص اس قسم کی حرکت کر بیٹھتا تو آپ اس کو ہرگز گوارا نہ فرماتے بلکہ اس پر سخت گرفت کر کے آئندہ کیلئے جتا دیتے کہ طلباء کی عظمت اور ان کا وقار اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہر کس و ناکس ان پر گرفت کرے، جو کوئی شکایت ہو وہ مدرسین کے علم میں لائی جائے تاکہ وہ خود اس پر مناسب سزا تجویز کریں یا کوئی اور اصلاحی قدم اٹھائیں۔ مشرقی طرز کے تعلیم یافتہ حضرات میں آج بھی ان مصالح کا شعور مشکل ہی سے پایا جاتا ہے اور بالعموم وہ طلبہ کے وقار کے تحفظ کو اہمیت نہیں دیتے نتیجہ یہ کہ یہ طلبا آئندہ عملی دنیا میں احساسِ پستی میں مبتلا نظر آتے ہیں!

اُصولِ تعلیم

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ۱۴ سال کی طویل مدت تک کانپور کے مدرسہ ''جامع العلوم'' میں درس دیتے رہے اور اس عرصہ میں آپ کے ذریعہ بیسیوں ایسے اہلِ کمال پیدا ہو گئے جنہوں نے اقطاعِ ہند میں پھیل کر علم کا نور پھیلایا، ان میں سے صرف چند کے نام درج ذیل ہیں۔

مولوی محمد اسحٰق صاحب بردوانی جنہوں نے جامعیت علوم کی بنا پر مدرسہ کانپور میں اپنے استاذ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی جانشینی کا شرف پایا اور پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں پہنچ کر علم دین کی شمع جلائی۔

مولوی احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ میں یدطولیٰ حاصل کیا اور فتح پور اور ضلع بارہ بنکی میں رہ کر اپنے اس فیض خاص کو عام کیا۔

مولوی فضل حق صاحب رحمۃ اللہ علیہ ساکن بارہ بنکی ضلع الہ آباد جنہوں نے، ''مشاۃ بالتکریر'' کی اعلیٰ تقریر لکھ کر علوم فلسفہ سے اپنی مناسبت خاص کا ثبوت دیا، اور ایک عرصہ تک قنوج میں مسند درس کو زینت بخشی۔

مولوی حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ جن کو عربی ادب اور معقولات میں ایسی مہارت حاصل تھی کہ حکیم الامت جب وعظ کرتے ہوتے تو آپ عربی میں اس کے نکات قلم بند فرماتے اور پھر اس کو اردو میں مفصل اس انداز سے لکھتے کہ اصل میں فرق نہ آنے پاتا، ''الانتباہات المفیدہ عن الاشتباہات الجدیدہ''۔ (جو نو تعلیم یافتہ طبقہ کے شبہات کے رد میں مولانا تھانوی کا لاجواب رسالہ ہے، کی ایسی شرح لکھی جس سے آپ کا معقولات میں تبحر ظاہر و عیاں ہے۔

مولوی سید اسحٰق علی صاحب کانپوری جوالہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔

مولوی ظفر احمد صاحب عثمانی، آپ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے خواہر زادے بھی ہیں اور آپ کی استعدادِ علمی پر حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کو اعتماد کلی تھا اسی لئے ''اعلاالسنن'' کا دقیق علمی کام آپ ہی کے ذریعہ کروایا گیا اور اس کی تکمیل پر مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اظہارِ مسرت بھی فرمایا۔ یہ گیارہ جلدیں مولوی صاحب ممدوح کی فقہ وحدیث میں مہارت و نظر دقیق کا مظہر ہیں، آپ ہندوستان و پاکستان کے گنے چنے علماء میں سے ہیں۔

غرض ایسے استاذ کامل کے اصول تعلیمی، جس کی آغوش تدریس سے ایسے ایسے علماء و فضلا نکلے، اس قابل ہیں کہ ان کا بطور خاص ذکر کیا جائے، ان کو سمجھا جائے اور ان پر عمل کر کے فائدہ اٹھایا جائے۔ وہ اصول یہ ہیں:

(۱) استاذ جو بھی مضمون پڑھائے، اس میں خود زیادہ مشقت اٹھائے اور اس کو آسان ترین صورت میں شاگردوں کے آگے رکھ دے۔ گو اس طریقہ میں استاذ پر کافی بار پڑتا ہے مگر جذبۂ شفقت اس بوجھ کو ہلکا کر دیتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جس میں یہ جذبہ نہ ہو وہ مسند تدریس پر کیوں آئے؟

(۲) پیچیدہ مقام کو پہلے بہت ہی آسان پیرایہ میں سمجھایا جائے اور جب بات ذہن نشین ہو جائے تو اس مسئلہ کا اصطلاحی تعارف کروایا جائے، چنانچہ آپ کے ایک شاگرد مولوی فضل حق صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جن کا ذکر اوپر آچکا) جب صدرا کے مشہور مقام ''مثناۃ بالتکریر'' [۱] پر پہنچے تو آپ نے پہلے مسئلہ کا نام لئے بغیر اس کی تشریح خوب ذہن نشین کرا دی اور بعد میں فرما دیا۔ ''یہ وہی مقام ہے جس کو مثناۃ بالتکریر کہتے ہیں''۔ اس پر وہ دنگ رہ گئے کہ ہم تو اس مسئلہ سے بہت گھبراتے تھے۔ مگر یہ تو کچھ مشکل نہ نکلا۔ واقعہ یہ ہے کہ رہرو کو اگر منزل کی دوری و دشواری کا علم پہلے ہی سے ہو جائے تو اس کی کمر ہمت بیٹھ جاتی ہے ورنہ پھر کمزور سے کمزور بھی چل نکلتا ہے اور منزل کو پالیتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی

---

[۱] یہ الجزاء الذی لایجزی کے ابطال پر ریاضی کے قاعدہ سے استدلال ہے۔

امر ہے۔ اور اساتذہ خواہ کوئی مضمون پڑھاتے ہوں ان کا نفسیات سے واقف ہونا ناگزیر ہے، اسی واقفیت و عدم واقفیت پر ان کی ناکامی اور طلباء کی پختگی و ناکامی کا مدار ہے!!

(۳) طلبہ کے آگے ضرورت سے زیادہ تقریر نہ کی جائے اور محض اپنی قابلیت کے اظہار کے لئے اصل مطلب کو الجھایا نہ جائے۔ چنانچہ آپ اپنے ماتحت مدرسین پر اس نقطۂ نظر سے کڑی نگرانی رکھتے تھے۔

(۴) ہفتہ واری تقاریر اور مباحثے نہ رکھے جائیں کیونکہ اس کے باعث طلبہ کی توجہ اسی ایک موضوعِ تقریر و بحث کی طرف لگی رہتی ہے اور اصل درس سے دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ایسا نکتہ ہے جس کی حقیقت کو آج بھی جانچا جا سکتا ہے۔ کالج اور جامعات کے وہ طلباء جو تقریر و مناظروں کے پختہ کار ہوتے ہیں، وہ امتحانوں میں کیا درجہ پاتے ہیں؟ کیا اس کی وجہ یہی نہیں جو حکیم الامت نے بتلائی؟ آپ فرماتے تھے کہ ''جب نصاب کی تکمیل اچھی طرح ہو جائے تو پھر تقریر و مناظرہ سب کچھ آ جاتا ہے۔ ورنہ ہمیشہ کے لئے خامی رہ جاتی ہے۔'' اس جملہ زریں کے پہلے حصہ کا ثبوت خود صاحبِ قول رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ہے اور اس کے دوسرے ٹکڑے کے ثبوت میں آج کل کے وہ سب طلباء آ جاتے ہیں جو طالب علمی کے دور میں اپنے اندر لیڈری کے جراثیم کو نشو ونما دیتے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی تباہی تو تمام تر اسی حلیمانہ رمز سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے!

(۵) طالبِ علم میں استعداد علمی پیدا ہونے کے لئے تین باتیں شرطِ لازم کا درجہ رکھتی ہیں:

(ا) وہ آئندہ سبق کا مطالعہ کر کے معلومات اور مجہولات میں تمیز پیدا کرے۔

(ب) پھر جب استاد سمجھانے لگے تو بلا سمجھے آگے نہ پڑھے۔

(ج) جب سمجھ چکے تو خود بھی اسی مطلب و مفہوم کو بیان کرے۔

(د) مذکورہ بالا تین باتیں تو واجب ہیں، ایک بات درجہ استحباب کی ہے وہ کہ کچھ

آموختہ روزانہ پڑھ لیا کرے۔ اب یاد رہے نہ رہے استعداد انشاء اللہ ضرور پیدا ہو جائیگی۔

یہ وہ اصول ہیں جن کے ذریعے طالب علم کو ۳۳ فیصدی والی کامیابی نہیں بلکہ درجہ اول کی کامیابی نصیب ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ۳۳ فیصدی والی کامیابی تو انگریز کے طرزِ تعلیم کی آوردہ ہے، ورنہ ہمارے قدیم نظامِ تعلیم میں اس درجہ کی کامیابی کوئی کامیابی ہی نہ تھی، کامیاب وہی ہوتا تھا ہے جو پڑھی ہوئی کتاب پڑھا بھی سکے۔

(ہ) کسی طالب علم کو اس کی مناسبت یا دلچسپی کے خلاف علوم سیکھنے پر مجبور نہ کیا جائے اور نہ ہی اس کو اس بنا پر سند سے محروم کیا جائے مثلاً اگر کوئی معقولات نہ پڑھے اور محض دینیات پڑھے تو اس کو بھی سند ضرور دی جائے "درسیات" (کے جو معقولات اور دینیات کی جملہ کتابوں پر حاوی اصطلاح ہے)، صرف "دینیات" لکھا جائے۔ حکیم الامت کا خاص وصف یہ ہے کہ کبھی نفسیاتی پہلو کو نظر انداز نہیں فرماتے تھے بلکہ پوشیدہ سے پوشیدہ امور تک بھی آپ کی نظر پہنچ جاتی تھی۔

ہمارا قدیم نظام تعلیم اور انگریزوں کا مروجہ جدید نظام تعلیم دونوں ہی اس نقطۂ نظر سے قابلِ ترمیم اور لایق اصلاح ہیں۔ نہ ہر طالب علم کے لئے سلم وشمس بازغہ اور حدیث وقرآن کی ایک ساتھ تعلیم ضروری و مناسب حال ہے اور نہ ہر ایک کے لئے تاریخ و جغرافیہ، ریاضی سائنس اور انگریزی وار دو ادب کا لزوم قرین عقل ہے۔

اکابر عصر کی خدمت میں

صوفیاء کرام کا مشہور مقولہ ہے:

یک در گیرد محکم گیر

یعنی اپنا معالج و مربی جب ایک کو بنالیا تو اب اسی کے ہو رہو، اسی کو اپنے حق میں سب سے زیادہ ''نافع'' سمجھو[1] اپنے علاج کے خیال و گمان سے بھی اب کسی اور پیر کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤ، گو کوئی کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ ع

ابن مریم ہوا کرے کوئی

اور یہ سختی مبتدی اور غیر مستحکم سالک کے لئے ہے ورنہ جس کا رابطہ قلبی اپنے شیخ سے کامل ہو چکا اس کے لئے اور بزرگوں کے فیض صحبت (نہ کہ فیض تربیت!) کی ممانعت بھی باقی نہیں رہ جاتی اور وہ ایک ہی کا رہتے ہوئے سب سے فائدہ اٹھالیتا ہے، شیخ شیراز سعدی علیہ الرحمۃ کا ارشاد ہے۔

تمتع زہر گوشۂ یافتم
زہر خرمنے خوشۂ یافتم

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کے مرید تھے اور پختہ مرید اس لئے آپ کا یہ تعلق اور بزرگانِ عصر کی تعظیم یا ان کی خدمت میں آپ کی حاضری سے مانع نہ تھا، چنانچہ آپ اپنے وقت کے تقریباً اکثر بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ اور ان کی شفقتوں، دعاؤں اور توجہات سے فائدہ اٹھایا ہے، خود بارہا فرمایا کرتے تھے:

''نہ کبھی طالب علمی میں میں نے محنت کی نہ اس طریق میں کبھی مجاہدات اور

---

[1] ملاحظہ ہو ارشاد الطالبین از قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہٗ نیز ملفوظات حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ

ریاضیات کئے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے، سب اپنے حضرات اساتذہ اور مشائخین کی دعا و توجہ اور میری طرف سے غایت درجہ ادب و عقیدت کا ثمرہ ہے۔"

ابتداً آپ مولانا رفیع الدین صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ مہتمم مدرسہ دیوبند کے حلقہ توجہ میں شریک رہے ہیں اور فرماتے تھے کہ اس قدر اثر محسوس ہوتا تھا جیسے بالکل پاک صاف ہوگیا ہوں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ آپ نے سرہند پہنچ کر حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے مزار کی زیارت کی اور واپسی میں ریاست پٹیالہ میں ان مقامات کی بھی زیارت کا شرف پایا جہاں پر بنائے کشف بعض انبیاء علیہم السلام مدفون ہیں۔ مولانا ممدوح کو آپ سے اس درجہ محبت تھی کہ مدتوں آپ سے اپنی مسجد میں امامت کروائی۔

خانوادۂ نقشبندیہ کے دو چشم و چراغ شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ ابو احمد بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ آپ ان بزرگوں کی زیارت سے بھی مستفیض ہوئے ہیں اور ان کے خصوصی برتاؤ سے ممتاز رہے ہیں۔ قطب وقت شاہ فضل الرحمٰن قدس سرہٗ سے تو اس درجہ محبت بڑھی کہ انہوں نے آپ کو اپنے احوال سنائے جو اوروں سے چھپاتے تھے مثلاً فرمایا" کہنے کی بات تو نہیں لیکن تم سے کہتا ہوں کہ جب سجدہ میں جاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے پیار کرلیا۔ بھائی جنت کا مزہ برحق، کوثر کا مزہ برحق، لیکن نماز میں جو مزہ ہے کسی چیز میں نہیں۔ بھائی ہم تو قبر میں بھی بس نماز ہی پڑھا کریں گے۔ دعا ہے کہ ہمیں تو اللہ میاں قبر میں یہ اجازت دیں کہ بس نماز پڑھے جاؤ۔"

کسی عقد کی شرکت کے سلسلہ میں پیلی بھیت جانا ہوا، یہاں ایک مشہور بزرگ شاہ محمد شیر خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دعا چاہی کہ دل میں اللہ کی محبت پیدا ہوجائے، اس پر شاہ صاحب نے فرمایا کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو رگڑو، جب آپ اس حکم کی تعمیل کرچکے تو پوچھا کہ کچھ گرمی پیدا ہوئی، عرض کیا کہ ہوئی۔ فرمایا بس اسی طرح قلب کو رگڑے جاؤ۔ انشاء اللہ محبت کی گرمی پیدا ہوجائے گی۔

حافظ غلام مرتضیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مجذوب پانی پتی جن کی دعائیں آپ کی پیدائش کا ذریعہ بنیں، ان مجذوب صاحب کے ایک صاحبزادے پیر احمد صاحب رحمۃ اللہ

علیہ بڑے صاحب کشف اور صاحب حال و قال بزرگ تھے، ان کو حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ سے اس درجہ محبت تھی کہ جب اپنے مرید کی دعوت پر تھانہ بھون تشریف لاتے تو غایت شفقت سے خود جا کر ملتے۔ ایک مرتبہ ادہر یہ گھر سے نکلے اور ادھر حکیم الامت آپ کی زیارت کے لئے خود بھی اپنے گھر سے چلے تو پیر صاحب تھوڑی دور چل کر اپنے گھر لوٹ گئے کہ اب تو وہ خود ہی آ رہے ہیں۔ کشف ہو گیا!

آپ حافظ تفضّل حسین صاحب ساکن بگھرہ ضلع مظفر نگر اور حافظ احمد حسین صاحب شاہجہانپوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے ہیں اور ان کی دعاؤں اور محبتوں سے شادکام رہے ہیں۔ حافظ صاحب شاہجہانپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ کسی کے لئے بد دعا کی اور وہ شخص دفعتاً مر گیا تو حافظ صاحب ممدوح نے پریشان ہو کر آپ سے تحریراً دریافت کیا کہ مجھے قتل کا گناہ تو نہیں ہوا:

اس کا جواب آپ نے بہت جامع اور تشفی بخش دیا، اس سے حافظ صاحب کے کمال تقویٰ کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی عیاں ہے کہ ان کی نظر میں آپ کی کیا وقعت تھی!

صوفی شاہ سلیمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ لاجپوری، ایک مشہور بزرگ گزرے ہیں خود ان بزرگ نے آپ سے کئی بار ملاقات فرمائی۔ ایک مرتبہ آپ راندیر سے سورت جا رہے تھے اور صوفی صاحب سورت سے راندیر راستہ میں ایک پل پر دونوں کی ملاقات ہوئی تو صوفی صاحب راندیر پہنچ کر دیر تک ایک مسجد میں بیٹھے روتے رہے اور کسی کے پوچھنے پر حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا نام لے کر کہا۔ ''نہ جانے آنکھوں سے کیا کر گئے''۔

ایک سلسلہ سفر میں مولانا غلام محمد صاحب دین پوری، مولانا تاج محمد صاحب امروٹی اور پیر جھنڈا صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ (جو سندھ کے مشہور مشائخ ہیں) سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی اور سب نے آپ کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ پیر جھنڈا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قیمتی خرقہ بھی عطا فرمایا اور اپنے مریدین کو وصیت فرمائی کہ جس امر میں اختلاف ہو آپ ہی سے رجوع کریں۔ مولانا تاج محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک مرید غلام حسین صاحب ہیڈ ماسٹر اسکول چاکیان شہزادہ کوٹ (ضلع لاڑکانہ سندھ) کے خط میں

حکیم الامت سے متعلق یہ رائے تحریر فرمائی:

''حضرت مولانا اشرف علی صاحب چونکہ اہلِ حق ہیں، ان کی محبت حق تعالیٰ جل شانہ کی محبت ہے۔''

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے آج کا ہر مسلمان واقف ہے۔ اور سیاسیات میں شیخ الہند اور حکیم الامت کی رائے میں جو اختلاف تھا وہ بھی آشکار ہے۔ اس کے باوجود شیخ الہند آپ کا اس درجہ احترام فرماتے تھے کہ ''سراپا فضل وکمال'' اور ''معدن حسنات وخیرات'' کے القاب سے مخاطب فرماتے تھے۔ اسی طرح جب بعض بدخواہوں نے اختلاف رائے کی وجہ سے آپ کو حضرت تھانوی سے برگشتہ کرانا چاہا تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا:

''افسوس تم ایسے شخص کی شکایتیں کرتے ہو جس کو میں ایسا ایسا (حکیم الامت نے ازراہ تواضع وہ الفاظ بتلائے نہیں) سمجھتا ہوں میں جو کچھ کر رہا ہوں کیا مجھ پر کوئی وحی آتی ہے؟ میری ایک رائے ہے اور ان میں ایک رائے اس میں اعتراض وشکایت کی کیا بات ہے۔''

قطب الارشاد مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے سب واقف ہیں اہل دل حضرات کے پاس آپ مسلمہ طور پر قطب ارشاد تھے۔ ''حکیم الامت نے پہلے آپ ہی سے بیعت کی درخواست کی تھی اس لئے تا آخر حیات آپ کے ساتھ شیخ ہی کا سا سلوک رکھا۔ آپ کی عقیدت ومحبت کا اندازہ آپ کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے۔ فرماتے تھے میں نے ایسا جامع ظاہر وباطن بزرگ کوئی نہیں دیکھا اور لوگوں کے ساتھ تو میری عقیدت استدلالی ہے۔ اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ غیر استدلالی دلائل سوچنا بھی خلاف ادب سا معلوم ہوتا ہے۔ قیام تھانہ بھون کے زمانہ میں حکیم الامت کے مواعظ ومشاغل کا حال سن کر آپ بہت خوش ہوتے تھے اور فرماتے تھے:

''یہ سب کچھ ہے مگر مجھے تو پوری خوشی اس وقت ہوگی جب کچھ اللہ اللہ کرنے والے بھی وہاں جمع ہونے لگیں۔''

چنانچہ قطب الارشاد کی یہ دعا بھی پوری ہوئی اور خانقاہ تھانہ بھون اللہ اللہ کرنے والوں کا مرجع بن گئی۔

اسی دور کے ایک اور بزرگ مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سہانپوری ہیں جو

حضرت گنگوہی کے خلیفہ اعظم اور علم وعمل میں اپنی آپ نظیر تھے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فرماتے تھے:

''مجھ کو اشرف سے اس وقت سے محبت ہے جس وقت ان کو خبر بھی نہ تھی۔''

آپ کے مواعظ کے متعلق یہ رائے رکھتے تھے:

''ان کے بیان میں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں، ان کے ہوتے کسی کا وعظ کہنا منہ چڑانا ہے۔''

بعض حاسدوں نے فریقین کے تعلق کو خراب کرنا چاہا اور جھوٹی روایات خدمت خلیل میں پہنچائیں۔ جب حکیم الامت کو اس کی خبر ہوئی تو صفائی کے لئے ایک عریضہ لکھا اور حقیقت حال ظاہر کر دی، جواب آیا:

''نہ معلوم لوگوں کو کیا مزہ آتا ہے کہ غلط روایتیں پہنچا کر اہلِ خیر کے قلوب کو دکھاتے ہیں مجھ ناچیز کو جو تعلق محبت پہلے تھی وہی عقیدت ومحبت بحمد اللہ موجود ہے۔

آں نیست کہ حافظ را مہرت رود از خاطر
آں وعدہ پیشینش تا روز پسیں باشد

انکے علاوہ آپ نے اور بزرگان عصر سے بھی ملاقاتیں کیں اور ان کے لطف وکرم سے شاد کام ہوئے۔ مثلاً مولانا عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ فرنگی محلی و مولانا محمد نعیم رحمۃ اللہ علیہ فرنگی محلی اور مولانا خلیل پاشا رحمۃ اللہ علیہ مکی (مقام مکہ معظّمہ) وغیرہ کو اپنے علم واخلاص سے متاثر کیا اور سب کے دل میں جگہ حاصل کی اہل حق میں یہ مقبولیت ایک عطیہ ربانی ہے۔

مختلف بزرگانِ دین کا اور خصوصاً اپنے شفیق اساتذہ کے علمی وعملی کمالات کا تذکرہ ہوتا تو آپ پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری رہتی اور دیر تک حال قایم رہتا، پھر فرماتے۔

اولئک آبائی فجئنی بمثلهم
اذا جمعتنا یا جریر المجامع

آپ بزرگوں کے تذکرہ کو اس درجہ مفید سمجھتے تھے کہ ''نزهت البساتين'' کے نام سے ایک ہزار حکایات خود آپ نے جمع کر کے شائع کروائیں اور بہت وثوق سے فرماتے تھے:

''یہ حضرات عشاق تھے ممکن نہیں کہ ان کے حالات پڑھے جائیں اور قلب میں محبتِ الٰہی پیدا نہ ہو۔

شیخ دوراں سے تعلق اور حج بیت اللہ

گزر چکا کہ حکیم الامت کی پیدائش ایک مجذوب کامل کی دعاؤں کا نتیجہ تھی اور انہی بزرگ نے آپ کا نام ''اشرف علی'' رکھا تھا اور آخر وقت تک اپنی محبت وتوجہ سے نوازتے رہے، ادھر مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبتیں اور عنایتیں بھی شامل حال تھیں، یہی وجہ ہے کہ شروع ہی سے غیر شعوری طور پر آپ میں عشق کے جلوے دکھائی دیتے تھے، ایک مرتبہ قطب ارشاد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کسی ضرورت سے دیوبند تشریف لائے تو آپ ایک ہی نظر میں گھائل ہو گئے، شوق سے مصافحہ کیلئے آگے بڑھے، لیکن جوش نیاز مندی نے بے قابو کر دیا تھا، پاؤں بے اختیار پھسل پڑا، اور حقیقتاً پاؤں کیا پھسلا دل ہاتھ سے نکل گیا۔

دل می رود وستم صاحبدلاں خدارا
دردا کہ راز پنہاں خواہد شد اشکارا

شیخ گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تھام لیا۔ گو بیعت اور اس کی حقیقت سے ناآشنا تھے مگر کشش اس بلا کی ہوئی کہ بیعت کی درخواست پیش کر دی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دورانِ تعلیم اس کو مناسب نہ سمجھا اور انکار فرمایا۔ لیکن خاطر اشرف میں یہ خیال بصورت حسرت نمو پاتا رہا۔ اور جب ۱۲۹۹ھ میں مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ عازم حج ہوئے تو خود انہیں کے ہاتھ شیخ دوراں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ کی خدمت میں ایک عریضہ گزرانا اور درخواست کی کہ آپ مولانا سے فرما دیں کہ مجھ کو بیعت کر لیں۔ '' نہ جانے دونوں عرفاء میں کیا راز و نیاز رہا، بہ ظاہر یہی ہوا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس عریضہ کے جواب میں خود ہی بیعت فرما لیا۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔

حضرت حاجی صاحب نے جس وقت ہندوستان کو خیر باد کہا ہے تو ابھی مولانا تھانوی کی ولادت بھی نہ ہوئی تھی لیکن سچ یہ ہے کہ جب بصیرت کی آنکھ کھل جاتی ہے تو زمان و مکان کے سارے قیود اور حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ رسول انور ﷺ کے نادیدہ عاشق صادق اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی زبانی اس حقیقت کو سنئے فرماتے ہیں۔

"زندہ اور چلتے پھرتے لوگوں کی طرح روحوں کے بھی جان ہوتی ہے۔ مومنین خواہ کبھی آپس میں نہ ملے ہوں اور نہ ان میں کوئی تعارف ہو، اور نہ باتیں کرنے کا اتفاق ہوا ہو۔ لیکن وہ سب ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور خدا کی روح کے وسیلہ سے باتیں کرتے ہیں خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں"۔[1]

غرض عارف باللہ شیخ العرب والعجم رحمۃ اللہ علیہ نے تھانہ بھون کے اس دُرِ اشرف کی چمک مکہ معظمہ میں بیٹھے بیٹھے دیکھ لی۔ اور آپ کے والد ماجد کو لکھ بھیجا۔ "تم حج کو آؤ اور جب آؤ تو اپنے لڑکے کو لیتے آؤ۔"

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب کہ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ ابھی تعارف بھی نہ ہوا تھا، مگر بہر حال شیخ کی کشش تو تھی ہی کچھ غیب سے اس کے سامان یوں پیدا ہوئے کہ مدرسہ دیوبند کی طرف سے تجارت کی ایک کمپنی قائم کی گئی اس میں مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد نے تین حصص پانچ پانچ سو کے خریدے، ایک اپنے نام سے اور دو اپنے دونوں صاحبزادوں کے نام سے لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد کسی وجہ سے ان حصص کی رقم واپس لے لی، اس پر آپ نے تحریراً پوچھا۔ "یہ پانچ سو روپیہ جو آپ نے میرے نام سے جمع کئے تھے اور اب واپس لئے ہیں میری ملک ہیں یا آپ کی؟ جواب آیا۔ "ابھی تک تو یہ رقم میری ہی ملک تھی اور تمہارا نام مصلحۃً درج کروایا گیا تھا۔ لیکن اب میں اس رقم کو دراصل تمہاری ہی ملک قرار دیتا ہوں۔" اس پر فرزندِ سعید نے عرض کی۔ "پھر اس رقم کی زکوٰۃ بھی میرے ذمہ واجب ہے اور اب حج بھی مجھ پر فرض ہو گیا۔" پدر بزرگوار نے

---

[1] دیکھو "تابعین" مولفہ دار المصنفین

ادائی زکوٰۃ کے لئے تو فوراً روپیہ بھجوادیا۔ البتہ حج کے متعلق لکھا کہ اس سال تمہاری چھوٹی بہن کے عقد سے فراغت ہو تو آئندہ سال حج کا قصد ہے۔ اس وقت تم بھی چلے چلنا۔''
آپ نے اس موقع پر فرزندانہ ناز سے کام لیا اور لکھا: ''آپ مجھے یہ لکھ کر دیجئے کہ تم پار سال تک ضرور زندہ رہوگے۔ میرے ذمہ تو حج فرض ہو چکا اور زندگی کا کچھ اعتبار نہیں پھر اس میں تاخیر بلا عذر شرعی جائز نہیں۔ اس لئے مجھے تو اسی سال حج کرنا ضروری ہے۔
آپ کے اس اصرار کو دیکھ کر آپ کے والد ماجد نے اپنی صاحبزادی کے عقد سے جلدی فراغت حاصل کی اور حج کا عزم فرمالیا۔ کیونکہ محبت اس کی اجازت نہ دیتی تھی کہ آپ کو تنہا سفر کرنے کی اجازت دی جائے۔
یہ شوال ۱۳۰۱ھ کا ذکر ہے، جب آپ نے اپنی طالب علمانہ زندگی ختم کر کے ابھی ابھی مسندِ تدریس سنبھالی تھی اور کانپور میں مقیم تھے۔
غرض حج کے سامان ہو گئے اور آپ اپنے والد ماجد کے ساتھ زیارتِ حرمین کے لئے روانہ ہو گئے، شوق کا یہ عالم تھا کہ جب کسی نے سمندر کے غیر معمولی متلاطم ہونے کا ذکر کیا تو جوش سے کہہ اٹھے۔

چہ غم دیوار امت را کہ باشد چوں پشتیبان
چہ باک از موج بحر آنرا کہ دارد نوح کشتیبان

اسی جذبہ سے معمور مکہ معظمہ پہنچے، شیخ عالی مقام رحمۃ اللہ علیہ سے نیاز حاصل کیا جو نعمت آنکھوں سے دور تھی سامنے آگئی، خود حضرت شیخ بے حد خوش ہوئے اور دست بدست بیعت سے سرفراز کیا۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد اپنے مرید سے فرمایا۔ ''تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ''۔ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کیلئے اس سے زیادہ مسرت کا کیا موقع ہوسکتا تھا لیکن آپ کے والد ماجد نے آپ کی جدائی گوارا نہ کی اور شیخ قدس سرہٗ نے احترام شریعت کی بنا پر اپنے مرید کی یوں تسلی فرمائی کہ ''والد کی اطاعت مقدم ہے، اس وقت چلے جاؤ پھر دیکھا جائیگا۔

چنانچہ آپ ۲۰ سالہ عمر میں سعادت حج پا کر ۱۳۰۲ھ میں خواہی نہ خواہی ہندوستان لوٹ آئے۔

قیام مکہ معظمہ کے دوران میں مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پر ارض پاک کا احترام وادب اس درجہ غالب رہا کہ وہاں تھوکتے ہوئے بھی تامل ہوتا تھا اور جس وقت بیت اللہ شریف پر پہلی نظر پڑی ہے تو ایسی کیفیت ''شوقیہ'' ''وانجذابیہ'' پیدا ہوئی کہ خود صاحب حال کا اعترف ہے:

''ایسی کیفیت مجھ پر عمر بھر کبھی طاری نہیں ہوئی۔'' اس کیفیت کو کوئی کیا بتائے اور کیسے بتائے۔

لفظ بیگانہ بھلا کیا ترجمانی کر سکیں
شوق بے اندازہ پیچیدہ وہ میرے دل میں ہے
(حضرت سلیمان رحمۃ اللہ علیہ)

حج ثانی اور صحبت شیخ

عشق کی چنگاریاں جو دبی دبی سی تھیں، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق اور ارضِ پاک مکہ کے قیام سے بھڑک اٹھی تھیں لیکن اب بھی ان میں سوختہ سامانی کی کیفیت پیدا نہ ہوئی تھی۔ حج سے واپس ہوکر کانپور میں درس وتدریس کا سلسلہ اور تحریر وتقریر کے مشاغل برابر جاری رہے، بیسیوں کو عالم بنایا اور سینکڑوں ہزاروں کے دل میں دین کی عظمت بٹھائی اور اس کا سکہ جمایا، ادھر شیخ عالی مقام سے خط وکتابت کے ذریعہ سلوک کی منزلیں طے ہوتی رہیں اور مقامات حاصل ہوتے گئے۔ اندر ہی اندر عشق الٰہی کی آگ بھڑک رہی تھی کہ ایسے میں ایک تفتہ جان حیدر آباد دکن سے کانپور آئے۔ پیر جی امداد علی صاحب جن کا ذکر ابتدائی اوراق میں آچکا اور جو مولانا کے ماموں تھے ان کے جذبۂ عشق وترکِ دنیا نے آپ کے جذبہ کو بے قابو کردیا۔ جو چیز اب تک چھپی تھی ظاہر ہو چلی۔

المدد توفیق ضبط والمدد تاب سکوت\
لب پہ لے آئے نہ جوشِ دل کہیں اسرار دل (حضرت سیدی رحمۃ اللہ علیہ)

شیخ تو تھے سمندر پار اور ادھر حالت ہو رہی تھی بے قابو، فوراً حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اپنا حال ظاہر کردیا اور احتیاطاً عربی میں لکھا تاکہ کسی غیر کی نظر پڑ بھی جائے تو بات چھپی رہے۔ دل پر کیا کچھ نہ گذری ہوگی۔ جبکہ آج بھی الفاظ پڑھ کر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس خط کے چند جملے سنئے:

فیا مولنا واللہ انی کنت فی ذالک الزمان غریقاً فی بحار الحیوٰۃ والطلب والتطلع الی من یخلصنی من ذا الوصب النصب. اذ نادی مناد من قریب من غیرا رادتی و قصدی ھات یدک بیدی

انجیک من ھذا البحر اللجی. وان الغریق یتشبت بکل حشیش لما ھو فیه من التھویش والتشویش وقد کنت من وراء البحار من حبیبی و مغیثی و طبیبی و معھذا ما ترکت بحمد الله یوما العمل بقول الاکابر خذ ما صفا دع ما کدر

ترجمہ: اے مولانا خدا کی قسم میں اس زمانہ میں حیرت وجستجو کے سمندروں میں غرق تھا اور ایسے شخص کو ڈھونڈ رہا تھا جو مجھے اس تکلیف اور پریشانی سے نجات دلائے یکایک بغیر میرے قصد وارادہ کے ایک منادی نے مجھے آواز دی کہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدے میں تجھ کو اس بحر ذخار سے نجات دلاؤں گا۔ چونکہ ڈوبتا تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ کیونکہ وہ پریشان ومشوش ہوتا ہے۔ اور میں تو اپنے حبیب ودستگیر اور اپنے طبیب سے اس طرح بچھڑا ہوا تھا کہ ہم میں سمندر حائل تھے۔ اس لئے میں نے اس منادی کی آواز پر لبیک کہی اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیدیا، لیکن اس کے باوجود بحمد اللہ میں نے ایک دن بھی اکابر کے اس قول پر عمل کو نہ چھوڑا کہ "خذ ما صفا دع ما کدر" جو اچھائی ہو لے لو اور برائی کو چھوڑ دو۔

ان احوال کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ۱۳۰۷ھ سے زندگی نے دوسرا پلٹا کھایا۔ باطنی شغل سے دلچسپی اس درجہ بڑھ گئی کہ سارے تعلقات سے دل سرد ہو گیا، اپنے شیخ عالی مقام سے ترک ملازمت کا مشورہ لیا مگر جواب آیا:

نامۂ بہجت شامۂ آن عزیز باتمیز رسید، از استماع حالِ ذوق وشوق آثار ترلی فہمید، مسرت بر مسرت افزود، حق تعالیٰ برکت زیادہ کند بہ خلق اللہ فیض دینی رسانیدن راہ قرب وصول الی اللہ است۔ (مکتوب نمبر ۴۴ م ۲۲ محرم ۱۳۰۸ھ)

جو لوگ حضرات چشتیہ پر قرآن وسنت سے دوری اور شریعت سے گریز کا اتہام باندھتے ہیں وہ سلسلہ چشت کے اس برگزیدہ شیخ کے خط کشیدہ الفاظ کو ذرا غور سے پڑھیں اور اس قسم کی بے سروپا باتوں سے اپنی عاقبت برباد نہ کریں۔

مرشد برحق کے اس ارشاد کو آپ نے سر آنکھوں پر رکھا اور ۱۳۱۰ھ تک ضبط وسکون

کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول رہے، لیکن اب شوق و اضطراب نے بے حد مجبور کر دیا اور شیخ عالی مقام کا ارشاد بار بار یاد آنے لگا کہ "میاں اشرف علی، تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ۔" کسی پہلو چین نہ آتا تھا۔ آخر ارادہ کر لیا، اسباب مہیا ہو گئے والد ماجد اس وقت تک انتقال فرما چکے تھے، شاگردوں اور دوستوں کو چھوڑ چھاڑ کر چل نکلے۔

تو باش ایجاد با خاصان بیامیز
کہ من دارم ہوا ے منزل دوست

حضرت حاجی صاحب تو چاہتے ہی تھے کہ چھ مہینے کے لئے یہ مرید رشید آ جائے۔ اب اس خواہش کو پورا ہوتا دیکھ کر اس درجہ مسرور ہوئے گویا یعقوب کو یوسف گم گشتہ مل گیا، عنایات و الطاف اس قدر بڑھے کہ اوروں کو حسد ہونے لگا۔ اور بعض تو آپ کے درپئے آزار بھی ہو گئے۔

بہر کیف ادھر قوتِ فیضان کا وہ حال اور ادھر کسب فیض کی صلاحیت کا یہ عالم کچھ ہی عرصہ میں شاگرد و استاد، مرید و پیر ہم رنگ ہو گئے۔ خود حضرت شیخ بے ساختہ فرمانے لگے:

"بس تم پورے پورے میرے طریق پر ہو۔"

جب اپنے مرید باکمال کی کوئی تحریر نظر سے گزرتی یا تقریر سننے میں آتی تو بے اختیار زبان شیخ کہہ اٹھتی:

"جزاکم اللہ تم نے تو بس میرے سینہ کی شرح کر دی"۔

پھر کیا عجب ہے کہ جب کوئی حضرت حاجی صاحب سے علم و عرفان کی کوئی بات پوچھتا تو آپ اپنے مرید اشرف ہی کی طرف اشارہ کرتے اور فرماتے:

"ان سے پوچھ لو، یہ خوب سمجھ گئے ہیں"

شیخ و مرید میں باطنی مناسبت، جو اصلی مناسبت ہے، پیدا ہو ہی چکی تھی لیکن خاطر شیخ میں ظاہری مناسبت کی تمنا بھی پنہاں تھی۔ حکیم الامت کے اسی دورانِ قیام مکہ میں آپ کی اہلیہ محترمہ اور خالہ صاحبہ بھی وہاں پہنچ گئی تھیں۔ خالہ صاحبہ نے خدمت شیخ میں عرض کی۔

http://mujahid.xtgem.com

''ان کے لئے صاحب اولاد ہونیکی دعا فرمایئے۔''

حضرت نے انکی درخواست تو مان لی۔لیکن باہر آکر اپنے مریدِ عزیز سے فرمانے لگے۔

''تمہاری خالہ مجھ سے دعا کے لئے کہتی ہیں کہ تمہارے اولاد ہو سو دعا تو میں نے کردی لیکن بھائی میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ جیسا میں ہوں ویسے ہی تم بھی رہو، جو حالت میری ہے وہی حالت تمہاری بھی رہے۔''

مریدِ باتمیز نے پوری بشاشت سے عرض کی۔

''جو حالت حضرت کو پسند ہے، وہی میں اپنے لئے پسند کرتا ہوں۔''

یہ جواب پاکر حضرت حاجی صاحب بڑے مسرور ہوئے کہ ہر اعتبار سے اپنا جانشین مل گیا۔اسی ایک بات سے اس خصوصی محبت وشفقت کا اندازہ ہوسکتا ہے جو شیخ کو اپنے مرید سے تھی، ہر طرح دل و جان سے یہی چاہتے تھے کہ اشرف علی ''امداد اللہ ثانی'' بن جائیں اور کبھی فرق نہ ہوسکے کہ ''من دیگرم تو دیگری''۔یہ اختصاص کسی اور مرید کے حصہ میں نہیں آیا!

ایک صاحب علم مولوی محمد احسن صاحب کو مکہ معظمہ میں مسئلہ وحدۃ الوجود کے متعلق یہ شبہ ہوا کہ یہ تو بالکل خلاف ایمان معلوم ہوتا ہے[1] حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے اس اشکال کو رفع کر کے یہ ثابت کر دکھایا کہ اس مسئلہ کے بغیر ایمان کامل ہی نہیں ہوتا۔ان کو آپ کی تقریر سے اس درجہ تشفی ہوئی کہ خوش ہوکر حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں یہ واقعہ نقل فرمایا، حضرت شیخ فرط مسرت سے کہہ اٹھے۔

''ہاں جی ہاں۔ان پر یہ مسئلہ خوب منکشف ہوا ہے۔''[2]

اس مرتبہ کے قیام مکہ معظمہ میں حکیم الامت پر ''توحید'' کا انکشاف بدرجہ اتم ہوا، جو شریعت وطریقت کی اساس اور درویشی وتصوف کا حاصل ہے اور جس کا لازمی نتیجہ

---

[1] اب بھی بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور اس کی وجہ مسئلہ کی حقیقت سے بے خبری۔اور اس کی غلط تشریحات ہیں۔(مؤلف)

[2] وحدۃ الوجود وحدۃ الشہود ظاہر ہے کہ تمام کمالات حقیقۃً اللہ تعالیٰ (بقیہ اگلے صفحے پر......)

''عبدیت'' ہے جو سلوک کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔ سارے انبیاء اسی مقام سے بدرجۂ کمال، ممتاز رہے ہیں اور ہمارے حضور انور ﷺ پر تو اس مقام کا کمال ''ختم'' ہے اور یہی آپ کا طرہ امتیاز ہے۔ پورے کلام پاک میں محض ''عبد'' کا لفظ کہہ کر اگر کسی کی ذات مراد لی گئی ہے تو وہ صرف حضور اکرم ﷺ ہی کی ذات والا صفات ہے۔ سبحان الذی اسری "بعبده" لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ (پاک ہے وہ ذات جو اپنے ''عبد'' یعنی محمد ﷺ کو رات کے ایک حصہ میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی)۔

کے لئے ثابت ہیں اور مخلوقات کے کمالات عارضی طور پر ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عطا وحفاظت کے سبب ان میں موجود ہیں ایسے وجود کو اصطلاح میں وجودِ ظلی کہتے ہیں اور ظل کے معنی سائے کے ہیں سو سائے سے یہ نہ سمجھ جائیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی جسم ہے اور یہ عالم اس کا سایہ ہے۔ بلکہ سائے کے وہ معنی ہیں جیسے کہا کرتے ہیں کہ ہم آپ کے زیر سایہ رہا کرتے ہیں یعنی آپ کی حمایت و پناہ میں، اور ہمارا امن و عافیت آپ کی توجہ کی بدولت ہے۔ اس طرح چونکہ ہمارا وجود بدولتِ عنایت خداوندی ہے اس لئے اس کو وجود ظلی کہتے ہیں۔ پس یہ بات یقیناً ثابت ہوئی کہ ممکنات کا وجود حقیقی اور اصلی نہیں ہے عارضی اور ظلی ہے۔ اب وجود ظلی کا اگر اعتبار نہ کیا جائے تو صرف وجود حقیقی کا ثبوت ہوگا اور وجود کو واحد سمجھا جائے گا۔ یہ ''وحدۃ الوجود'' ہے اگر اس کا بھی اعتبار کیجئے کہ آخر کچھ تو ہے بالکل معدوم تو ہے نہیں گو غلبۂ نور حقیقی سے کسی مقام پر سالک کو وہ نظر نہ آئے تو یہ ''وحدۃ الشہوذ'' ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ نور مہتاب نور آفتاب سے حاصل ہے اگر اس نور ظلی کا اعتبار نہ کیجئے تو صرف آفتاب کو منور اور ماہتاب کو تاریک کہا جائے گا۔ یہ مثال وحدۃ الوجود کی ہے۔ اور اگر اس کا نور بھی اعتبار کیجئے کہ آخر اس کے کچھ تو آثار خاصہ ہیں گو وقت ظہور نور آفتاب کے وہ بالکل مسلوب النور ہو جائے یہ مثال وحدۃ الشہود کی ہے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں یہ اختلاف لفظی ہے۔ مآل کار دونوں کا ایک ہے۔ اور چونکہ اصل وظل میں نہایت قوی تعلق ہوتا ہے اس کو اصطلاح صوفیہ میں ''عینیت'' سے تعبیر کرتے ہیں اور عینیت کے یہ معنی نہیں کہ دونوں ایک ہوگئے، یہ تو صریح کفر ہے۔ چنانچہ وہی صوفیائے محققین اس عینیت کے ساتھ غیریت کے بھی قائل ہیں۔ پس یہ عینیت اصطلاحی ہے نہ کہ لغوی۔

مسئلہ کی تحقیق تو اسی قدر ہے، اس سے زیادہ اگر کسی کے کلام منثور یا منظوم میں پایا جائے تو وہ کلام حالت سکر کا ہے اور نہ قابل ملامت نہ لائق تقلید!! (تعلیم الدین از حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ)

غرض تقریباً ٦ مہینے کے قیام کے بعد حکیم الامت نے اپنے شیخ عالی مرتبت سے رخصت چاہی۔ عارف باللہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دو وصیتیں بطور خاص فرمائیں۔

(۱) دیکھو میاں اشرف علی ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت پیش آئے گی عجلت نہ کرنا!

(۲) کبھی کانپور کے تعلق سے دل برداشتہ ہو جاؤ تو پھر دوسری جگہ تعلق نہ کرنا توکل بخدا تھانہ بھون جا کر بیٹھ جانا۔"

گویا ۱۳۰۸ھ میں جس ترکِ تعلق کو منع فرمایا تھا اب بعد حصول "تمکین" خود اس کے ترک کا مشورہ دے رہے ہیں۔

غرض ان وصیتوں اور باطنی دوستوں کو لے کر آپ ۱۳۱۱ھ مالا مال ہندوستان لوٹ آئے۔

ایک واقعہ یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو اشرف السوانح میں درج نہیں لیکن خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض خلفاء سے راقم نے راست سنا ہے، وہ یہ کہ جب حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے رخصت ہونے کا وقت آیا تو حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ مراقب ہوئے اور پھر فرمایا:

"حیرت ہے [۱] قاسم و رشید سے ان کا درجہ بڑھ گیا"۔

حضرت مولانا تھانوی کی تجدیدی مساعی اور آپ کے فیض کا اطرافِ ہند میں پھیلاؤ حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کے ارشاد کی کھلی دلیل ہے!

واللہ یختص برحمتہ من یشاء

---

[۱] یعنی مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہم اللہ، جن کے متعلق حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے پوچھیں گے کہ کیا لائے ہو تو میں قاسم و رشید کو پیش کر دونگا۔

واپسی اور قیام وطن

مکہ معظّمہ گئے تھے اس حالت میں کہ نو جوانی تھی، خداداد جمال وجلال ایسا کہ طالب علمانہ سادگی کے باوجود ہر نظر میں سماتے اور ہر دل میں اتر جاتے تھے مگر شش ماہا قیام کے بعد جب لوٹے ہیں تو عشق کے ہاتھوں وہی حال ہو چکا تھا، جس کا خاکہ زمانۂ طالب علمی میں خود ہی کھینچ چکے تھے۔

عشق می ساز د زمال و جاں جدا   عاشقاں را نیست مطلب جز خدا
عشق، عاشق را کند زار و نزار   عشق، عاشق را کند رسوا و خوار
عشق ساز د زرد روئی عاشقاں   ہم کند ژولیدہ موئے عاشقاں
عشق معشوق است مرعشاق را   من لہوب العشق ہم قالو بلی

(مثنوی زیروبم)

کانپور میں ۱۳۱۵ھ تک قیام

ہندوستان پہنچ کر پھر مدرسہ ''جامع العلوم'' کانپور کی خدمت میں مشغول ہو گئے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ پھر کیفیت ''شوقیہ الہیہ'' نہایت جوش وخروش سے وارد ہوئی، مگر اس دفعہ اس میں کلفت کے بجائے لذت اور نا گواری کے بدلے خوشگواری تھی۔ شیخ کی خدمت میں حاضری سے قبل کی کیفیت شوقیہ ''سیر الی اللہ'' کا نتیجہ تھی اور موجودہ کیفیت ''سیر فی اللہ'' کے باعث تھی۔ وہ حالت مشاہدہ سے پہلے کی تھی اور یہ اس کے بعد کی، وہ ''اثرِ عشق'' تھا اور یہ ''اثرِ حسن''! خود ہی فرماتے تھے: ''جی چاہتا تھا کہ ساری دنیا کو ذاکر وشاغل اور ولی کامل بنادوں۔'' چنانچہ اسی غلبہ حال کی وجہ سے شروع شروع ''حلقۂ توجہ'' بھی منعقد فرماتے تھے۔ تا کہ اپنا ایقان مریدوں میں بھی جلد از جلد پیدا ہو جائے۔

اس زمانہ میں اثر کا یہ عالم تھا کہ توجہ لینے والے تاب نہ لا سکتے تھے اور بے قابو ہو جاتے تھے، اس کی وجہ سے مدرسہ مدرسہ ہی نہ رہا بلکہ خانقاہ بھی بن گیا تھا۔ سارے طلبہ و اساتذہ ذکر و شغل سے سرمست و سرشار تھے۔[۱] اس کی اطلاع جب حضرت شیخ کو ہوئی تو جواب آیا:

"ماشاء اللہ آپ اور آپ کے متعلقین کے ذوق و شوق کی کیفیت سن کر طبیعت نہایت ہی خوش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ بائیں ہمہ ذکر و شغل دائم مشغول رکھے، دن بدن ترقی در ترقی عطا فرمائے، مقصود اصلی تک پہنچائے[۲] آمین ثم آمین۔

لیکن اہلِ بصیرت جانتے ہیں کہ یہ تو ایک حال تھا اور حال کو قرار کہاں! ع

"گاہ ہست و گاہ نیست"

---

[۱] حکیم الامت نے ابتداءً غلبۂ ذوق و شوق میں حلقۂ توجہ بھی منعقد کیا تھا لیکن بعد میں اس کو اپنے مشرب سے الگ قرار دے دیا۔

[۲] ذوق و شوق مقصودِ اصلی نہیں: ذوق مطلوب نہیں کیونکہ وہ ایک حال ہے نہ کہ مقام اور مقام مطلوب ہیں نہ کہ احوال اور فرق دونوں میں اختیاری و غیر اختیاری ہونے کا ہے۔ اہلِ فن کا قول ہے: "**المقامات مکاسب و لا حوال مواھب**" حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ طالب لذت طالب حق نہیں کام میں لگنا چاہئے ثمرہ پر نظر نہ چاہئے اسی طرح شوق مطلوب نہیں عمل مطلوب ہے بلکہ عمل بلا شوق میں زیادہ تعب کے باعث زیادہ اجر ہے، اور یہ نکتہ عمر بھر پلے میں باندھ لینے کے لائق ہے۔ مقصد اصلی طلب رضائے الٰہی ہے۔ جب مسلمان کو خدائے تعالیٰ سے محبت اور عشق ہے تو بس اس کو اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ حق تعالیٰ کی رضا حاصل ہو چاہے اس میں اپنا یا دوسرے کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ بس رضائے حق کی تلاش کرو جب رضا مل گئی تو رضائی (یعنی ظاہری راحت) بھی مل جائے گی، لیکن رضائی کی نیت سے رضا کو مت طلب کرو۔ رضائی ملے تو خیر نہ ملے تو ٹھٹھر کر مر جاؤ کیونکہ جیسے رضائی تمہاری نہیں بلکہ ان کی عطیہ ہے ایسے ہی جان بھی تمہاری نہیں ہے۔ غرض اپنی طرف سے اسی کیلئے آمادہ ہو، باقی عبادۃ اللہ یہی ہے کہ رضا کے ساتھ رضائی بھی ملتی ہے۔

(مواعظ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ)

چنانچہ جب مقامات میں[1] رسوخ بڑھتا گیا تو اس ''شوق'' نے اور ہی رنگ اختیار کیا، نظر بلند تر ''مقامات'' پر پڑنے لگی۔ اور ان کے حصول کی تڑپ پیدا ہوئی اور اس نے اضطراب والتہاب کی ایک کیفیت پیدا کردی جیسی قیام مکہ سے پہلے ہوئی تھی۔ لیکن دونوں کی اصل میں زمین وآسمان کا فرق تھا، اس دفعہ کی کیفیت ''طلبِ ابتدائی'' کا نتیجہ تھی۔ اور موجودہ حالت ''طلب مزید'' کا۔ اسی لئے اب کی حیرانی وپریشانی بھی سخت تر لاحق ہوئی! یہ وہی کیفیت تھی جس کی پیشن گوئی حضرت شیخ نے اپنے مرید کو واپس کرتے وقت فرمائی تھی۔

سارے مشاغل سے دل سرد ہوگیا، کہاں کا درس اور کیسا وعظ؟ اہل کانپور جو آپ کے مواعظ کے دلدادہ تھے، بیتاب ہوگئے۔ ایک مرتبہ ایک بڑا جلسہ تھا، بیرونی علماء بھی آئے ہوئے تھے اراکین مدرسہ ان علماء کو لے کر آپ کی خدمت میں آئے اور وعظ گوئی کے لئے اصرار کیا۔ اکابر علماء کو دیکھ کر نہ انکار بن پڑتا تھا نہ اپنی حالت کے پیش نظر اقرار ممکن تھا۔ جب کچھ نہ بن آیا تو گردن جھکائے آنسوؤں کی زبانی اپنا حال دل سنانے لگے۔ یہ دیکھ کر مولانا ظہور الاسلام فتح پوری رحمۃ اللہ علیہ کا دل پگھل گیا اور بے ساختہ ان کی زبان سے یہ شعر نکلا۔

عشق نے غالب نکمہ کردیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اپنے ساتھیوں سے فرمایا ''بس بھائی بس اب انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو تنگ نہ کرو۔''

اسی طرح ایک اور موقع پر شاہ سلیمان صاحب پھلواری رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے ہوئے تھے، ان سے بھی کانپور والوں نے عرض کی کہ وہ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کو لب

---

[1] حال اور مقام: سالک کے قلب پر جو کیفیت غیب سے نازل ہو جس میں اس کا کچھ اختیار نہیں اس کو ''حال'' کہتے ہیں۔ اور جس مرتبہ سلوک میں اس نے پختگی واستقامت حاصل کی ہو وہ ''مقام'' ہے پس ''مقام'' تو سالک کے تحت میں ہوتا ہے اور ''حال'' کے تحت میں سالک ہوتا ہے۔'' (تعلیم الدین حکیم الامت)

کشائی پر آمادہ کریں تو انہوں نے عجیب جواب دیا۔ فرمایا:

''اگر ایسی حالت میں اس شخص سے وعظ کہلوایا تو بس ممبر پر بیٹھتے ہی اسکے منہ سے پہلا لفظ جو نکلے گا وہ ''انا الحق'' ہوگا ایسی حالت میں اصرار ہرگز مناسب نہیں۔''

ان کی اس رائے کی تصدیق بعد کو خود حکیم الامت نے بھی فرمائی کہ اس زمانہ میں مجھ پر توحید کا بہت غلبہ تھا۔ اس لئے میں نے وعظ کہنا چھوڑ دیا تھا کہ نہ جانے منہ سے کیا نکل جائے اور عوام کو غلط فہمی ہو کر دینی نقصان پہنچے۔''

دیکھئے کہ اس غلبۂ حال میں بھی مصلحت عامہ کا خیال کس قدر عجیب و نایاب ہے! یہ اسی ہستی سے ممکن ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اصلاح امت کے لئے چن لیا ہو!!

غرض یہ کیفیت التہاب بڑھتی چلی گئی، پیر جی امداد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ابھی کانپور ہی میں مقیم تھے۔ اور ماموں ہونے کی وجہ سے ان سے ربط قائم ہی تھا، اس حالت میں کچھ ان سے چارہ جوئی بھی کی، لیکن ظاہر ہے کہ ''طریق مصطفوی'' ﷺ کے چلنے والے کی کیفیات و احوال کو ایک ایسا شخص کیا جان سکے، جو نئے و بربط کی پر پیچ وادیوں سے گھوم گھام کر کسی مقام تک پہنچا ہو!!

نتیجہ یہ کہ پیر جی صاحب کی ہر تدبیر بے فائدہ اور ان کی ہر دوا بے نتیجہ ہی نہیں بلکہ مرض کی زیادتی کا باعث ہوئی اور حالت بے قابو ہونے لگی۔ اتفاقاً کوئی صاحب مکہ معظمہ جا رہے تھے حکیم الامت نے ان کے ذریعہ اپنے پورے احوال لکھ بھیجے اور گویا اس کا بھی اعتراف کیا کہ۔

چنداں کہ گفتیم غم با طبیباں
درماں نہ کردند مسکین غریباں
با حال خود را با یار گفتیم
نتوان نہفتن درد از حبیباں

جب یہ عریضہ شیخ العرب والعجم کی خدمت میں پہنچا تو آپ کا یہ عالم تھا کہ کبھی گھر

میں تشریف لے جاتے اور کبھی باہر نکل آتے اور بار بار فرماتے:

''جوان آدمی ہیں غلبہ ہو گیا ہے تحمل نہیں ہو سکا، مگر میں تو اتنی دور ہوں کیا کروں؟''

اس پر جو صاحب عریضہ لے گئے تھے انہوں نے کہا: ''حضرت میں جلد ہی جانے والا ہوں۔''

بس یہ سن کر خاطرِ شیخ میں سکون و سرور کی لہر دوڑ گئی، جواب ان کے حوالے کر دیا اور فرمایا:

''ان سے کہنا کہ جب تک تمہارا خادم زندہ ہے کیوں کسی دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہو۔''

جب یہ صاحب ہندوستان لوٹ آئے اور حکیم الامت کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو عین دوپہر کے وقت مشتاقانہ ان کے گھر پہنچے، انہوں نے والا نامہ حوالے کیا اور زبانی پیام بھی۔ اس سے جو اثر ہوا اس کا حال زبانِ اشرف سے سنئے:

''قبل ظہر انہوں نے مجھے حضرت کا یہ پیغام سنایا تھا۔ بس سنتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے دہکتے ہوئے تنور پر کسی نے بھری ہوئی مشک چھوڑ دی اور جلتے ہوئے سینے پر برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہو عصر تک نصف سے بھی کم پریشانی رہ گئی اور مغرب تک تو بس مطلع بالکل صاف تھا۔''

سر بسر ''شوق'' و ہمہ درد ہماری تحریر
سر بسر مایہ ''تسکین'' ہے تمہارا مکتوب
(حضرت سیدی مدظلہٗ)

غرض یوں ''شوق'' کی کیفیت ''اُنس'' میں بدل گئی اور جس طرح اس مرتبہ کی کیفیت شوقیہ پہلے سے بہت اعلیٰ تھی، اسی طرح یہ کیفیت ''اُنس'' بھی گزشتہ کیفیت سے کہیں ارفع تھی۔ اصل یہ ہے کہ راہ سلوک ایک سیدھی مگر ہموار و مسطح نہیں بلکہ نشیب و فراز کی راہ ہے، اس میں اتار چڑھاؤ مسلسل چلا جاتا ہے مگر اس کا ہر اتار پچھلے چڑھاؤ سے بہتر اور ہر چڑھاؤ پچھلے اتار سے اس لئے اہم تر ہے کہ منزلِ مقصود سے قرب ہوتا جاتا ہے۔

مشہور ہے کہ ''کہ از حق انس گیرد از خلق وحشت گیرد'' چنانچہ رفتہ رفتہ آپ کو بھی تعلقات سے وحشت ہونے لگی، یہاں تک کہ کانپور جیسے پسندیدہ مقام سے اور اپنے قائم کردہ مدرسہ سے بھی برداشتہ خاطر ہوگئے۔ حضرت شیخ کی نصیحت یاد آئی کہ اگر کبھی کانپور سے دل برداشتہ ہو جاؤ تو پھر توکل بخدا تھانہ بھون ہی میں جا کر بیٹھ جانا۔

۱۳۱۴ھ کے ختم پر اب ٹھان لی کہ خانقاہ تھانہ بھون کو، جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ محمد صاحب محدث تھانوی کی برکات سے ''دکانِ معرفت'' کہلاتی تھی اپنا گوشۂ عافیت بنایا جائے۔ مگر کانپور کے فریفتہ و گرویدہ لوگوں سے بے مروتی بھی کیسے گوارا ہو سکتی تھی اپنی خداداد فراست سے اس گتھی کو سلجھا لیا۔ اتفاقاً ان دنوں مدرسہ کی مالی حالت کچھ خراب تھی اس بہانہ سے پہلے اپنی تنخواہ سے دست بردار ہوئے۔ پھر اپنی جگہ مولوی اسحٰق صاحب بردوانی رحمۃ اللہ علیہ کو مدرس اول بنایا۔ اور اپنے لئے محض سرپرستی کی خدمت رکھ لی، اس کے بعد اہلِ کانپور سے کچھ دن آرام لینے کا عذر کر کے آخر صفر ۱۳۱۵ھ میں خوش خوش کانپور سے چل نکلے اور تھانہ بھون آ کر اس کی اطلاع حضرت شیخ کی خدمت میں پہنچائی جواب آیا:

''بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے آئے، امید ہے کہ آپ سے خلایق کثیر کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا۔ آپ ہمارے مدرسہ کو از سر نو آباد کریں۔ میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور خیال رہتا ہے۔'' (مکتوب نمبر ۳۶ م ۱۲ ربیع ۲ ۱۳۱۵ھ)

یہاں رہ کر حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ وقتاً فوقتاً مدرسہ کانپور کے حالات دریافت فرماتے رہے تاکہ اہلِ کانپور یہ نہ سمجھنے لگیں کہ آپ نے ہمیشہ کے لئے ترک تعلق فرمایا ہے مگر جب اطمینان ہوگیا کہ اب مدرسہ کی مشین ٹھیک نہج پر چل رہی ہے اور اب اپنے عزم کے اظہار سے اس میں خلل کا اندیشہ نہیں رہا ہے تو مدرسہ والوں کو لکھ بھیجا کہ۔

''از قیل و قال مدرسہ حالے دلم گرفت
یکچند نیز خدمت معشوق می کنم''

اہلِ کانپور کے دلوں پر یہ خبر برق بن کر گری، ان لوگوں نے درخواست کی کہ مدرسہ کا کوئی کام حضرت کے ذمہ نہ ہوگا۔ لیکن قیام تو کانپور ہی میں رہے آپ نے جواب میں اصل حقیقت ظاہر کردی کہ جو کچھ کیا گیا وہ مرشد عالی مقام کے حکم سے تھا۔ ان لوگوں نے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کے قیام کانپور کی اجازت چاہی، لیکن حضرت قدس سرہٗ نے ان کو اور خود حکیم الامت کو یہی لکھ بھیجا:

"فقیر کے نزدیک مستقل قیام آپ کا تھانہ بھون میں ضروری ہے باقی تعطیل وغیرہ کسی فرصت میں یا جس وقت طبیعت کچھ گھبرائے تو کانپور کا دورہ بھی کریں اور ان لوگوں کی خبر گیری کریں۔ اور طالب کے لئے تو تھانہ بھون کانپور سے کچھ دور نہیں۔"

۱۳۱۵ھ سے مستقل قیام تھانہ بھون

۱۳۱۵ھ سے حکیم الامت کا وہ دور شروع ہوتا ہے جو تا آخر حیات باقی رہا۔ یعنی مستقل قیام تھانہ بھون۔ آپ اس معرفت گاہ میں پہنچ کر جس کی رونق مولانا شیخ محمد صاحب محدث تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت، حضرت حافظ ضامن رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت اور حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرت کی وجہ سے ماند پڑ چکی تھی[1]، پھر باعث فروغِ رونق ہوئے، کانپور چھوٹا اپنے قائم کردہ مدرسہ سے تعلق نہ رہا والد ماجد کی دولت و ثروت کو مشتبہ پا کر ان کے ترکہ سے ایک حبہ بھی لینا گوارا نہ کیا۔ بس اپنے شیخ عالی مقام کی نصیحت پر متوکلاً علی اللہ ہمہ تن مشغول بحق ہوگئے۔

بہ سودائے جاناں زجاں مشتغل
بہ ذکر حبیب از جہاں مشتغل

---

[1] شیخ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے طبعی موت پائی۔ حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں فرنگ کی گولی کا نشانہ بنے اور اسی خلفشار کی بنا پر اس زمانہ میں حضرت حاجی صاحب مکہ معظمہ ہجرت کر گئے۔ (مؤلف)

اس دوران میں کوئی ذریعہ آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے ابتداءً قرض ہوگیا تو آپ نے حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں دعا کے لئے تحریر کیا اور حضرت گنگوہی سے بھی یہی درخواست کی، مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''کہو تو مدرسہ دیوبند میں تمہارے لے مدرسی کی تحریک کردوں''۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے ادب سے عرض کیا:

''میرا تو اس وقت عرض کرنے کا مقصود صرف دعا ہے، باقی حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بعد ترک تعلق کانپور کسی اور جگہ کوئی تعلق کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ لیکن اگر حضرت کی یہی تجویز ہے تو میں اس کو بھی حضرت حاجی صاحب ہی کی تجویز سمجھوں گا اور یہ سمجھوں گا کہ حضرت حاجی صاحب ہی نے اپنی پچھلی تجویز کو منسوخ فرما کر اب یہ صورت تجویز قرار دی ہے۔ کیونکہ تجویز موخر ناسخ ہوتی ہے تجویز مقدم کی۔''

یہ سن کر مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''نہیں نہیں اگر حضرت حاجی صاحب کی ممانعت ہے تو میں ہرگز اس کے خلاف مشورہ نہیں دیتا میں دعا کروں گا اللہ تعالیٰ قرض سے سبکدوش فرمائے۔''

اس طرح دونوں بزرگوں کی دعاؤں سے بہت جلد قرض کی ادائی کی صورت نکل آئی۔ آپ اپنی جگہ بیٹھے ہوئے اصلاح باطن کے کام میں مشغول رہے اور رفتہ رفتہ خانقاہ کی رونق بڑھتی چلی گئی۔ اس دور میں آپ کا رنگ کچھ اور تھا۔ خود سراپا سوز گداز تھے۔ اس لئے جو آتا سوختہ وگداختہ ہو جاتا، ایک ''بسمل تیر نظر کا'' کا شعر ہے ؎

نگاہوں سے بھر دی رگ و پے میں بجلی — نظر کردہ برق تپاں ہو رہا ہے (مجذوب)

ایک آخری روحانی گھاٹی

ولایت کا کیا ذکر نبوت بھی پھولوں کی سیج پر نہیں ملتی جوہر نبوت یوں تو ہر نبی میں اسکی پیدائش ہی سے رکھ دیا جاتا ہے لیکن یہ جوہر مجاہدات و ریاضیات اور روحانی و جسمانی

مصائب وآلام ہی سے جلا پاتا ہے[1] اور جس کا رتبہ جتنا اعلیٰ ہوتا ہے اس پر ان تکالیف کا درود بھی اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔ چنانچہ سید الانبیاء ﷺ کا ارشاد ہے

اشد الناس بلاءً الانبیاء فالا مثل فالا مثل

''یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ مصائب انبیائے کرام پر آئے ہیں۔ اور ان کے بعد پھر درجہ بدرجہ جو ان سے زیادہ مماثلت رکھتے تھے۔''

اور نبی کی روحانی تکالیف کا حقیقی ادراک ایک غیر نبی سے کیا ممکن ہے، جب کہ ایک ''ولی'' کی اس قسم کی کیفیات کا ادراک بھی بلا ان مراحل سے گذرے محال ہے اس بات کو عقلی طور پر یوں سمجھئے دیکھئے کہ انسان کو راحت اور نفع پر خوشی اور تکلیف ونقصان پر رنج کب ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا مدار انسانی دماغ کی صحت وتندرستی پر ہے ورنہ کسی پاگل اور مخبوط الحواس کو تو کسی نعمت کے ملنے کی خوشی یا اس کے نہ ملنے کا رنج نہیں ہوا کرتا، پھر غور کیجئے کہ یہ خوشی اور یہ غم تو ان چیزوں کے متعلق ہے جو ہماری چندروزہ زندگی سے متعلق ہیں اور جن کی بے ثباتی کا ہم کو یقین کامل ہے۔ تو جب ان فانی چیزوں کے ملنے نہ ملنے سے محض صحتِ دماغ اور صحتِ حواس ظاہرہ کی بنا پر وہ تکلیف ہوتی ہے کہ بعضے تو اس کی تاب بھی نہیں لا سکتے تو کیا عالم ہوگا اس مسرت ورنج کا جو ابدی اور لازوال دولت کے ملنے یا نہ ملنے اور اس پائیدار و باقی زندگی میں کوئی نقص آنے یا نہ آنے کے احساس سے پیدا ہو۔ اور خود یہ احساسات کس درجہ قوی ہوں گے جو محض دماغ ہی کی نہیں بلکہ ''قلب'' کی صحت اور حواس باطنی کی بیداری کا نتیجہ ہوں!!! اسی لئے کسی عارف کا قول ہے:

بر دلِ سالک ہزراں غم بود!!
گرز باغ دل خلا لے کم بود!!

حکیم الامت بھی سلوک کی منزلیں طے کرتے رہے، کتنی ہی گھاٹیوں سے اتارے گئے اور چڑھائے گئے۔ اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ آپ کو ایک اعلیٰ ترین مقام پر فائز

[1] تفصیل کے لئے دیکھو ''مدارج النبوت'' از حضرت عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

کرے۔ اور اس راہ کی دشوار ترین گھاٹی سے بھی گزار دے تا کہ پھر دوسروں کی رہبری میں آپ کو حیرانی و پریشانی نہ ہو۔

ہوا یہ کہ آپ کی بڑی اہلیہ کے خالو صاحب کو ایک مقدمہ کے سلسلہ میں دشمن کاشتکاروں نے شہید کر دیا، اس کی اطلاع پا کر آپ اپنی اہلیہ کے ساتھ فوراً چرتھاول پہنچے۔ تجہیز و تکفین کے سارے مراحل اپنے سامنے پورے کرائے اور اس وقت بظاہر آپ پر اس کا کوئی خاص اثر نہ تھا مگر بعد دفن جب گھر لوٹے اور مستورات کے رونے کی آواز کان میں پڑی تو مجروح قلب پر ایک ایسی کاری ضرب لگی کہ اختلاج سا ہو گیا ابھی اس سے نجات بھی نہ ملی تھی کہ دو تین ہی دن کے اندر اندر گنگوہ میں ایک اور عزیز کا انتقال ہو گیا۔ اور اس غمی میں بھی شرکت ہوئی جس سے پہلے زخم پر خوب نمک پاشی ہوئی، اسی حالت میں پچھلی رات کو نمازِ تہجد کے قصد سے وضو کر رہے تھے کہ یکا یک بلا کسی قصد و ارادہ کے ایک ''خطرۂ منکرہ [1]'' وارد ہوا، چند الفاظ دفعۃً متخیلہ میں آ گئے۔ اور گو یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر اس مرتبہ اس درجہ کا شدید اثر ہوا کہ زندگی ہی سے دل سرد ہو گیا، خودکشی کے وسوسے آنے لگے خود فرماتے تھے:

> ''ایک بار ایک صاحب ملنے آئے، ان کے پاس اس وقت بھری ہوئی بندوق تھی، بار بار جی میں آتا تھا کہ ان سے کہدوں کہ خدا کیلئے فائر کر کے میرے ناپاک وجود سے دنیا کو پاک کر دو۔ کیونکہ فرعون و ہامان سے بھی بدتر ہوں۔ وہ جس بلا میں مبتلا ہیں اس سے ایمان لا کر ایک منٹ میں چھٹکارا پا سکتے ہیں اور میں جس بلا میں مبتلا ہوں اس سے سالہا سال میں بھی خلاصی ممکن نہیں۔''
>
> یہی نہیں بلکہ دونی مصیبت یہ تھی:

''اگر ذکر کرنے بیٹھتا (جو کہ قرب کی حالت تھی) تو ساتھ ہی ساتھ وہ ''خطرۂ منکرہ'' بھی عود کرتا اور اگر عودِ خطرہ سے بچنے کی غرض سے ذکر کو منقطع کرنا چاہتا (جو کہ بُعد تھا) تو اس

---

[1] یعنی ایمانی تقاضوں کے خلاف وسوسہ جو خیال میں آ کر جم گیا تھا۔

کو بھی کسی طرح دل گوارا نہ کرتا تھا، گویا یہ حالت تھی۔

من شمع جاں گدازم تو صبح دلکشائی سوزم گرت نہ بینم میرم چورخ نمائی
نزدیک آنچنانم، دور انچنانکہ گفتم نے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

''غرض سخت کشمکش میں مبتلا تھا اور ایسی شدید حالت تھی کہ باوجود صحت بدنی کے موت کو حیات پر ہزار درجہ ترجیح دیتا تھا۔''

حسن اتفاق سے یہ بات قیامِ گنگوہ میں پیش آئی تھی، صبح ہوتے ہی فوراً اپنا حال زار حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے آگے رکھ دیا، جو جواب عطا ہوا اس کی قدر و قیمت اہلِ فن ہی جان سکتے ہیں۔ حضرت گنگوہی نے ارشاد فرمایا:

''التفات نہ کیا جائے۔''

حکیم الامت وطن لوٹ آئے لیکن حالت وہی قائم رہی بلکہ بڑھتی گئی اور یہاں تک بڑھی کہ اختلاجِ قلب کے شدید دورے پڑنے لگے اور چند ہی دن میں آپ بہت کمزور ہو گئے۔ حکیم محمد صدیق صاحب گنگوہی اتفاقاً تھانہ بھون آئے ہوئے تھے، ان سے رجوع کیا، حکیم صاحب نے قارورہ دیکھا تو تعجب کیا کہ یہ زندہ کیونکر ہیں، قارورہ تو صاف بتا رہا ہے کہ حرارتِ عزیزی بالکل فنا ہو چکی ہے، اپنی ساری کوشش علاج میں لگا دی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا اور ہوتا بھی کس طرح، یہ تو وہ درد تھا جسکا علاج ''خزانہ غیب'' ہی سے ہو سکتا تھا۔

آپ نے پھر خانقاہ کا قیام ترک کر کے سفر اختیار کیا۔ عجیب کیفیت تھی کبھی خالی بندوق لے کر فائر کرتے اور اسی میں لطف پاتے، کئی بار حضرت گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی حالت بیان کی مگر اس حکیم حاذق نے جو نسخہ روز اول بتلا دیا تھا اسے بدلنے کی کوئی وجہ نہ پائی اور نہ بدلا یہی فرماتے رہے کہ خطرات کی طرف التفات نہ کرو۔

اسی اثناء میں آپ نے اپنے شیخ ذی شان کو بھی اپنے حال سے مطلع فرمایا، جواب آیا:

''الحمد للہ آپ کے قلب کی حالت بہت اچھی ہے، یہ ''مقامِ خوف ورجاء'' ہے اسی کو ''ہیبت انس'' کہتے ہیں، کبھی ''ہیبت'' اور کبھی ''انس'' کا غلبہ ہو جاتا ہے دونوں کو

ایک سمجھنا چاہیئے۔فقیر دعا کرتا ہے جو کچھ قلب پر وارد ہو منجانب اللہ خیال کرو۔ جو واردات مضر ہوں گے اس مراقبہ سے سب دفع ہو جائیں گے، اس قسم کی گھاٹیاں طالب کو آیا ہی کرتی ہیں انشاء اللہ سب سے پار ہو جاؤ گے۔ (مکتوبات نمبر ۴۴ تا ۴۶)

پھر ایک والا نامہ میں تشفی بخشی گئی:

''آپ کی حالت اب بہت اچھی ہے، فقیر دعا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ترقی فرمائے۔''

غرض تقریباً ایک برس تک یہ ''غلبہ ہیبت'' طاری رہا۔ اور حضرت شیخ کی حیات ہی میں اس گھاٹی سے بھی عبور نصیب ہو گیا، اس یکسالہ مدت میں آپ پر جو کچھ گزری اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ایک مرتبہ جب کسی مرید نے اپنی باطنی پریشانیوں کی تفصیل لکھ کر بھیجی تو آپ نے فرمایا:

جو جو مضایق و مصائب وعقبات و بلیات آپ نے لکھی ہیں یہ سو حصوں میں سے ایک حصہ بھی نہیں جو بعض کو پیش آئے ہیں، اس وقت مجھ کو بعض (مراد خود حکیم الامت) کے احوال یاد آ گئے اور سر سے پاؤں تک اس نے مجھ کو ہلا دیا۔''

یعنی غلبۂ ہیبت کے فرو ہونے کے پندرہ برس بعد بھی محض اس وقت کی یاد نے سر سے پاؤں تک ہلا دیا تو اب سوچیئے کہ عین اس حالت میں کیا کچھ نہ گذری ہوگی۔ جس پر بیتتی ہے وہی جانے!

اہلِ فن جانتے ہیں کہ اس شدید اور مدید ''ہیبت'' کے بعد کس قدر لازوال اور ترقی پزیر ''انس'' میسر آیا ہوگا اور کیسا ''رسوخ'' و تمکن حاصل ہوا ہوگا کیونکہ ہر عسر کے بعد یسر پیدا کرنا اور ہر بلا کے بعد عطا سے سرفراز کرنا اللہ تعالیٰ کی عادت ہے۔ اور اسی لئے اس قسم کی بلائیں بھی (جو پیش خیمۂ عطا ہوں) قابلِ قدر ہوتی ہیں اور اسی لئے شیوخ اپنے مریدوں کو اس پر مبارکباد دیا کرتے ہیں۔

الحاصل آپ کو وہ مرتبہ ملا جس کو ''عبدیت'' کہتے ہیں، جس کی لازمی صفت بندگی و سرافگندگی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ گلاب کی ایک پنکھڑی سے بوئے گل کا اندازہ ہو سکتا ہے تو پھر ذیل میں ایک ملفوظ درج ہے اس سے حکیم الامت کی شان عبدیت کا پتہ لگایئے

فرماتے ہیں:

''بہ قسم کہتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو کسی مسلمان سے حتیٰ کہ ان مسلمانوں سے بھی جن کو لوگ فساق و فجار سمجھتے ہیں فی الحال اور کفار سے بھی احتمالاً فی الحال افضل نہیں سمجھتا اور آخرت میں درجات حاصل ہونے کا کبھی مجھے وسوسہ بھی نہیں ہوتا، کیونکہ درجات تو بڑے لوگوں کو حاصل ہوں گے مجھے تو جنتیوں کی جوتیوں میں بھی جگہ مل جائے تو اللہ کی بڑی رحمت ہو، اس سے زیادہ کی ہوس ہی نہیں ہوتی اور اتنی ہوس بھی بربنائے استحقاق نہیں بلکہ اس لئے کہ دوزخ کے عذاب کا تحمل نہیں اور یہ جو میں بہ ضرورت اصلاح زجر و توضیح کیا کرتا ہوں اس وقت یہ مثال میرے پیش نظر رہتی ہے کہ جیسے کسی شاہزادہ نے جرم کیا ہو اور بھنگی جلاد کو حکم شاہی ہوا ہو کہ اس شاہزادے کو درے لگائے تو کیا اس بھنگی جلاد کے دل میں درے مارتے وقت کہیں یہ بھی وسوسہ ہوسکتا ہے کہ میں اس شہزادے سے افضل ہوں؟ غرض کوئی مومن کیسا ہی بداعمال ہو میں اس کو حقیر نہیں سمجھتا بلکہ فوراً یہ مثال پیش نظر ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی حسین اپنے منہ پر کالیک (سیاہی) مل لے تو اس کو جاننے والا کالیک کو برا سمجھے گا لیکن اس حسین کو حسین سمجھے گا اور دل میں کہے گا کہ جب کبھی بھی صابن سے منہ دھولے گا اور پھر اس کا وہی چاند سا منہ نکل آئے گا۔ غرض مجھ کو صرف فعل سے نفرت ہوتی ہے فاعل سے نہیں۔''

سارے تصوف اور ساری صوفیانہ تربیت کا حاصل یہ ہے کہ بندہ کو بندگی پر قائم رکھا جائے اور اس کے ذہن و فکر سے بڑائی و بزرگی کے ہر شائبہ کو مٹا کر تواضع کے وصف اعلیٰ سے مزین کیا جائے۔ بس یہاں وہی صاحبِ کمال ہے جو عبدیت پر قائم ہے اور یہ وہ معیار ہے جو خود حق تعالیٰ کا قائم کردہ ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

(یعنی انسانوں اور جنوں کو کسی اور بات کے لئے پیدا ہی نہیں کیا گیا بجز اس کے کہ وہ ہمارے غلام بنے رہیں)

مسند ارشاد پر

یوں توج ثانی کے بعد کانپور ہی سے رشد و ہدایت اور اصلاح باطنی کا کام شروع ہو چکا تھا اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے بعض بعض مریدوں کو آپ کی خدمت میں بھیجنے لگے تھے اور پھر تھانہ بھون پہنچ کر اس تعداد میں کافی اضافہ ہو چکا تھا مگر گذشتہ ''مرحلہ ہیبت'' کے تقریباً سال بھر میں یہ کام رکا رہا اور خود آپ ہی نے اس کو مصلحتاً ملتوی رکھا تھا۔ لیکن جب اس شدید اور آخری مرحلہ سے بھی حق تعالیٰ نے گزار دیا تو اب ''مسند ارشاد'' پر مستقلاً جلوہ فرما ہوئے اور ہمہ تن تزکیہ وتصفیہ خلق کے کام میں مشغول ہو گئے۔

محسن کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ مشہور نعت گو شاعر کے فرزند مولانا، نور الحسن کاکوروی کا ایک خواب درج ذیل ہے، اس سے آپ کے منجانب اللہ مقام ارشاد پر فائز ہونے اور اپنے وقت کے مجدد ہونے کی بشارت ملتی ہے[۱]۔

''میں نے سفر حج میں بمقام مدینہ طیبہ حضرت مولانا تھانوی مدظلہٗ کے متعلق ایک خواب دیکھا، حالانکہ اس زمانہ میں مجھ کو حضرت مولانا سے کوئی خاص عقیدت بھی نہ تھی، البتہ ایک بڑا عالم سمجھتا تھا اور میرا خاندان بھی علمائے حق کا کچھ زیادہ معتقد نہ تھا، غرض حضرت مولانا کا مجھ کو مدینہ طیبہ میں کوئی بعید سے بعید خیال بھی نہ تھا کہ ایک شب خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضور پُرنور ﷺ ایک چارپائی پر بیمار پڑے ہوئے ہیں اور حضرت مولانا تھانوی تیمارداری فرمارہے ہیں اور ایک بزرگ دور بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے، جن کے متعلق خواب ہی میں معلوم ہوا کہ یہ طبیب ہیں۔ آنکھ کھلنے پر فوراً میرے ذہن میں یہ تعبیر آئی کہ حضور ﷺ تو کیا بیمار ہیں حضور ﷺ کی امت بیمار ہے اور حضرت مولانا اس کی تیمارداری یعنی اصلاح فرمارہے ہیں، لیکن وہ بزرگ طبیب جو دور بیٹھے نظر آئے تھے وہ سمجھ میں نہ آئے کہ کون تھے۔ واپسی ہندوستان پر میں نے حضرت مولانا کی خدمت میں یہ خواب لکھ کر بھیجا اور جتنی تعبیر میری سمجھ میں آئی تھی وہ بھی لکھدی اور یہ بھی لکھ دیا کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ وہ بزرگ

---

[۱] سچے خوابوں کا بشارت ہونا حدیث سے ثابت ہے۔

طبیب کون تھے جو دور بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا نے تحریر فرمایا کہ وہ حضرت امام مہدی علیہ السلام ہیں اور چونکہ ابھی زماناً بعید ہیں اس لئے خواب میں مکاناً بعید دکھائی دیئے۔[1]

اسی منشاء کا ایک اور واضح تر خواب حکیم الامت کے ایک خلیفہ مجاز حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری مدظلہٗ (حال مقیم لاہور) نے دیکھا تھا وہ بھی درج ذیل ہے:

"کچھ عرصہ ہوا (تقریباً ۱۳۵۰ھ کا ذکر ہے) خانقاہ شریف کی مسجد کے وسط میں بیت اللہ شریف اور حضور پرنور ﷺ کے روضۂ پاک کو دیکھا کہ دونوں بالکل قریب ہیں اور بیت اللہ شریف غالباً حضرت والا کی سہ دری کی طرف ہے لیکن روضۂ پاک بھی بیت اللہ شریف ہی کی شکل کا ہے یعنی اس پر گنبد نہیں ہے اور بیت اللہ شریف اور روضۂ پاک دونوں پر اس قدر سبز اور خوبصورت غلاف ہیں کہ دنیا میں ان کی نظیر نہ ہوگی اور دونوں پر شعائیں اور انوار معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت والا بیت اللہ شریف کے پاس کھڑے ہوئے ہیں اور اس قدر خوش ہیں کہ ایسا ہشاش بشاش میں نے حضرت والا کو کبھی نہیں دیکھا، نیز ایک کھجور کی ٹہنی بطور جھاڑو کے دست مبارک میں لئے ہوئے ہیں جس کی ڈنڈی میں دستہ چھوڑ کر ادھر ادھر شاخیں نکلی ہوئی ہیں اور یہ ارادہ فرما رہے ہیں کہ بیت اللہ شریف اور روضۂ پاک کے ارد گرد جو غبار ہے اس کو دور فرمائیں۔"

سبحان اللہ کس وضاحت سے حکیم الامت کے مصلح امت محمدیہ ﷺ اور مجددِ سنتِ مطہرہ ﷺ ہونے کو عیاں کیا گیا ہے!

چنانچہ آپ نے تھانہ بھون کے گوشہ میں بیٹھ کر دنیائے دوں کو ٹھکرا کر مسلمانوں کی جو حقیقی خدمت انجام دی اور اس ذریعہ سے ان کے قلوب کی جو پادشاہی حاصل کی وہ کم کسی کے نصیب میں آتی ہے۔

صرف ہندوستان کے شمال وجنوب اور مشرق ومغرب ہی سے نہیں بلکہ ایران کے

---

[1] اس میں تو یہی اشارہ ملتا ہے کہ شاید حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مہدی علیہ السلام کے درمیان اور کوئی مجدد پیدا نہ ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم (مؤلف)

سبزہ زاروں، آفریقہ کے ریگستانوں کے ساحلوں اور برطانیہ کی تاریکیوں سے بھی روشنی کے طالب آئے اور اس شمع ضیاء پاش سے اپنی اپنی بساط بھر روشنی لے گئے۔ وہ بھی آئے جن کی پیاس اور چشموں سے نہ بجھتی تھی اور اس دریائے پرآب نے انہیں سیراب کردیا۔

مریدین اور معتقدین کی آمد سال کے ۱۲ مہینوں ایسی متواتر و مسلسل رہتی تھی کہ حکومت نے اس کی وجہ سے قصبۂ تھانہ بھون کو ایک مستقل ریلوے اسٹیشن قرار دیا، اور اس ''دکانِ معرفت'' پر خریداران علم وعرفان کا وہ ہجوم ہوا جو حضرت سلطان الاولیاء قدس سرہٗ اور حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے بعد تاریخ ہند میں شاید اپنی نظیر آپ تھا!

آپ کے مریدین اور معتقدین میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ہزار افراد شامل ہیں حالانکہ اس بازار میں یہ جنس ایسی ارزاں نہ تھی جیسی اور جگہ مل جاتی ہے اس کے باوجود ''مجازین'' کی تعداد (۱۳۹) تک پہنچ گئی تھی، جس میں (۷۰) ''مجازین بیعت'' ہیں جن کو اصطلاح عام میں خلفاء کہا جاتا ہے۔ اور (۵۹) ''مجازین صحبت'' جن کو بیعت لینے کی اجازت تو نہیں البتہ تبلیغ کی اجازت حاصل ہے، پھر مذکورہ ستر ۷۰ خلفاء میں ہر ہر طبقہ کے حضرات شامل ہیں۔ وہ بھی ہیں جو اعلیٰ انگریزی تعلیم یافتہ ہیں جیسے:

خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب بی۔اے ایل ایل بی علیگڑھ) رحمۃ اللہ علیہ اور ڈاکٹر محمد عبد الحیؒ صاحب مدظلہ بی۔اے ایل ایل بی علیگڑھ) ہومیو پیتھ وغیرہ۔

اور وہ بھی ہیں جو علم ظاہری سے زیادہ علاقہ نہیں رکھتے جیسے:

حاجی محمد عثمان خاں صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مالک کتب خانہ اشرفیہ اور حضرت محمود الغنی صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ اور ساتھ ہی وہ بھی ہیں جو اپنے وقت کے علامہ اور اپنے دور کے کامل اساتذہ ہیں۔ مثلاً (۱) سید العلماء علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہٗ۔ (۲) مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری نور اللہ مرقدہٗ سابق شیخ الجامعہ اشرفیہ رحمۃ اللہ علیہ لاہور۔ (۳) مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی مدظلہٗ بانی دارالعلوم کراچی۔ (۴) مولانا عبدالباری صاحب ندوی مدظلہٗ سابق پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔

(۵) مولانا عبد الرحمٰن صاحب کیمبل پوری سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارنپور۔
(۶) مولانا محمد طیب صاحب قاسمی مدظلہ مہتمم دار العلوم دیو بند وغیرہ۔

حکیم الامت کو یہ شرف بھی ملا تھا کہ جس طرح حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے دور میں اکثر علماء واتقیاء آپ ہی کے خوان فیض کے زر بردار تھے اسی طرح اس دور کے تقریباً سارے چوٹی کے علماء اسی دریائے فیض سے سیراب وسرشار رہے۔ ع

یہ رتبہ بلند جس کو مل گیا!

اب اس عنوان کے خاتمہ پر چند خواب نقل کئے جاتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کی محبوبیت اور آپ کے طریق کی صحت کا پتہ چلتا ہے۔ ویسے صاحب نظر کے لئے تو کھلی کھلی علامات اتنی ہیں اور ایسی روشن ہیں کہ ان "منامیات" کی کچھ حاجت نہ تھی، تاہم چونکہ بعض لوگوں کا ذوق "حدیث خواب" ہی سے تسکین وتشفی پاتا ہے، اور بحمد اللہ یہاں اس کی بھی کچھ کمی نہیں، اس لئے مشتے نمونہ از خروارے پیش ہے۔

(۱) ایک دفعہ حضور (یعنی حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ) کو احقر نے خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ سے گفتگو فرما رہے ہیں اور بھی بہت سے علماء حاضر خدمت ہیں لیکن سب کی طرف سے حضور ہی کو دیکھا کہ سوال فرماتے ہیں اور رسول کریم ﷺ جواب ارشاد فرماتے ہیں اور سب سے اقرب رسول کریم ﷺ کے ساتھ حضور ہی کو دیکھا۔

(محمد عتیق اللہ۔ تھانہ اسرائیل گاؤں۔ بنگال)

(۲) احقر کو پنجشنبہ میں حضور پر نور ﷺ کی زیارت ہوئی اور یہ دیکھا کہ حضور سرور ﷺ کائنات احقر کے والد صاحب مدظلہٗ [1] کی دوکان پر تشریف فرما ہیں اور حضرت والا

---

[1] ایک محسن کی یاد پر دو آنسو: اب کس قلم سے صاحب رویا کے والد ماجد کے نام کے ساتھ مدظلہٗ لکھا جائے، آہ یہ سایہ بھی اٹھ چکا اب مرحوم حضرت حاجی محمد عثمان خان صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ حکیم الامت کے خلفائے قدیم میں سے تھے۔ نوجوانی سے حضرت کے ساتھ رہتے تھے اور آخر کار خلافت سے ممتاز ہوئے۔ مرحوم کو اپنے شیخ سے اس درجہ محبت تھی کہ ساری عمر یہ معمول بنا رکھا تھا کہ دو مہینے میں تین دن ضرور شیخ کی خدمت میں حاضر رہتے، جب شیخ کا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کی تصنیف کردہ کتابیں حضور پر نور ﷺ کے دست مبارک میں ہیں۔" (عبدالمنان خان دہلوی)

اس رویا میں تصنیفات وتالیفات اشرفیہ کی مقبولیت کا کھلا ارشاد ہے۔

(۳) احقر نے دیکھا کہ حضرت رسول کریم ﷺ ایک راستہ سے چلتے ہیں اور ان کے پیچھے انحضور (یعنی حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ) بھی اور ان کے بعد بندہ بھی غرض تینوں ایک ساتھ چلتے ہیں۔" (از کانپور)

وصال ہوا تو غم اس درجہ غالب رہا کہ مہینوں روتے رہے اور بصارت کے زائل ہونے کا قوی امکان ہوگیا، ایسے میں شیخ کی رویت نصیب ہوئی دیکھا کہ گلے لگا کر ان کے شانوں پر بوسہ دے رہے ہیں اس دن سے سکون میسر آیا۔ مرحوم مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ اور ان کی تصنیفات کے قدیم ناشر تھے اور ایک ماہوار رسالہ "الابقاء" کے ذریعہ مواعظ کی تشہیر کرتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی آکر اس کام کو تا آخر حیات جاری رکھا۔ احقر جب کراچی آیا تو نیاز مندانہ حاضر خدمت ہوا۔ مرحوم کی درویشی و سادگی اور محبت و شفقت نے بار بار کی حاضری پر مجبور کیا۔ اس زمانہ میں موصوف کو ریاحی تکالیف تھیں، احقر کے فن ہومیو پیتھک سے لگاؤ کا علم ہوا تو اصرار سے علاج کروایا اور اللہ تعالیٰ نے شفا بخشی، اس طرح عقیدت و شفقت کا علاقہ اور مستحکم ہوا۔ لیکن سب سے زیادہ جس وجہ سے مرحوم کی عنایات احقر کے شامل حال رہیں وہ سیدی وسید المسلمین مولانا سید سلیمان ندوی سے میری نسبت ارادت تھی۔ مرحوم کو حضرت سیدی سے محبت ہی نہیں عقیدت تھی جس کا اظہار بار بار فرماتے تھے۔ ایک دفعہ دہلی میں حضرت سیدی مدظلہٗ خود مرحوم کی دوکان پر جا کر ملے تھے اور مرحوم سے فرمایا تھا کہ "یہ توشۂ آخرت کی ملاقات ہے۔" اس واقعہ کو مرحوم نے کتنی بار سنایا اور روتے ہوئے فرمایا کہ یہ تیر آج تک دل میں چبھا ہوا ہے۔

مرحوم اپنے والد کی طرف سے حج بدل کا ارادہ رکھتے تھے اور پورے سامان کر چکے تھے مگر فالج کے پے در پے حملوں نے اس کو پورا ہونے نہ دیا اور آخر ۷ رمضان المبارک ۱۳۶۹ھ میں محبت و شفقت کا یہ سایہ ہمیشہ کیلئے اٹھ گیا۔

دورانِ مرض میں احقر سے دو وصیتیں کی تھیں، فرمایا تھا: "حالت رنج والم میں چونکہ عزیزوں کو ہوش نہیں رہتا اس لئے آپ سے کہتا ہوں کہ (۱) میری نماز جنازہ کیلئے مولوی محمود الغنی صاحب (جو مرحوم کے ہم رنگ پیر بھائی اور مولانا تھانوی کے خلیفہ ہیں) (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس سے مسلک اشرفیہ کے عین مطابق سنت ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔

(۴) جمعۃ الوداع کی شب کو فدوی نے ایک خواب دیکھا کہ بندہ کسی جگہ پر بیٹھا ہوا حلقہ کررہا ہے۔ اوراوپر سے ایک تخت نمودار ہوا جس میں چار چراغ روشن تھے۔ اور چار ہی اصحاب نظر آئے۔ وہ اصحاب مجھے تخت پر بٹھا کر اپنے ہمراہ لے گئے اور پھر جنگلوں کی طرف لے گئے۔ اور پھر سمندر بھی نظر آیا اوراس سمندر کے اوپر سے بھی وہ تخت گزر گیا، پھر اسی طرح منزل بہ منزل چلتے ہوئے ایک مسجد دکھائی دی۔ یہاں پر وہ تخت ٹھہرا وہاں نماز پڑھی اوراس مسجد کی پچھلی طرف ایک نہر بھی چلتی تھی، اس نہر میں سے انہوں نے اور میں نے پانی پیا پھر وہاں سے تخت پر بیٹھ کر ایک بازار آیا وہاں سب طرح کا سامان بک رہا تھا۔ انہوں نے اس تخت کو بازار میں ٹھہرایا۔ اور ایک دوکان پر لکھا ہوا تھا۔ ''یہاں پر رشیدیہ اوراشرفیہ کتابیں مل سکتی ہیں۔'' تو میں نے اسے پڑھ کر ان بزرگوں سے دریافت کیا کہ مجھے مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا اشرف علی صاحب کی کتابیں دے دو۔ انہوں نے چار کتابیں مجھے دیں ان سے وہ کتابیں لے کر پھر اسی تخت پر بٹھا کر رخصت ہوئے۔ پھر ایک سفید مکان دکھائی دیا جس پر سبز پردے پڑے تھے۔ وہاں تخت ٹھہرا اس کمرے کے اندر چاروں بزرگ مجھے بھی لے گئے اوراس کمرہ کی روشنی اس قدر تھی کہ تاب نہیں لاسکتا تھا اور نہ چراغ نہ بتی دکھائی دیتی تھی، وہاں پر تکیہ اور قالین بچھا ہوا تھا۔ جس پر سرور جہاں ﷺ مع چاروں اصحاب رضی اللہ عنہم کے موجود تھے۔ اور ہمارے رسول خدا ﷺ کو سفید اونی کپڑے

سے عرض کریں کیونکہ ہمارے حضرت ان سے بہت محبت فرماتے تھے۔ (۲) میری قبر کہیں ایسی جگہ بنائیں کہ جلد پیروں میں روندی جا کر مٹ جائے۔'' ان وصایا پر عمل اس طرح ہوا کہ مولانا محمود الغنی صاحب کو عذر شرعی ہونے کی وجہ سے حکیم الامت کے بھانجے مولانا احتشام الحق صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور شہر سے بہت دور ایک گوشہ میں دو بجے رات کی تنہائی میں اس درویش کے جسم کو پیوند خاک کیا گیا۔ نوراللہ مرقدہ عجیب بات یہ ہوئی کہ چند ہی دنوں بعد ایک مرتبہ بارش جو ہوئی تو قبر بے نشان تھی، مگر بعد میں ورثاء نے پھر مٹی ڈال کر اس کا نشان قائم کردیا۔ خیر مرحوم کی تمنا پوری ہوگئی۔ رحمۃ اللہ علیہ (مؤلف)

پہنائے جارہے تھے، کپڑے پہننے کے بعد اسی تکیہ سے کمر لگا کر بیٹھ گئے اور میں دروازہ کے باہر ان کے سامنے کھڑا ہوا ہوں تو پھر مجھے انہوں نے اندر بلالیا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ شریف احمد ہے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "اس کو بلالو۔ یہ مولانا اشرف علی صاحب کا خادم ہے۔" میں سلام کر کے بیٹھ گیا اور مصافحہ کیا، وہاں پر ایک گلاس پانی کا آیا پھر آنحضرت ﷺ نے پیا اور پھر چاروں اصحاب نے پی کر مجھے بھی دیا اور میں نے بھی پیا اور آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ "مولانا صاحب کی کتابوں پر عمل کرتے رہنا اور دوسروں کے کہنے سے مت رُکنا۔"

(شریف احمد سقہ کنج پوری۔ تحصیل وضلع کرنال)

اس رؤیا سے حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے مرتبۂ عالی آپ کے سلسلہ کی صحت ومقبولیت آپ کے فیوض علمی کی حقانیت اور اس دور میں آپ کے متروکہ خزانۂ علمی کی قدر ومنزلت کا پتہ چلتا ہے۔

(۵) ڈھاکہ (مشرقی بنگال) میں ایک بزرگ نے جو حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے شناسا نہ تھے خواب میں حضور انور ﷺ کو دیکھا کہ فرماتے ہیں "اشرف علی صاحب کو میرا سلام پہنچانا۔" ان بزرگ نے عرض کی حضور ﷺ میں تو ان سے واقف نہیں، ارشاد ہوا، "ظفر احمد کے ذریعہ" (یہ بزرگ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مدظلہٗ جو حکیم الامت کے حقیقی بھانجے ہیں اور ڈھاکہ میں مقیم تھے ان سے واقف تھے) چنانچہ صبح کو ان بزرگ نے مولانا ظفر احمد صاحب سے واقعہ کا اظہار کیا اور مولانائے موصوف نے اس کی اطلاع حکیم الامت کی خدمت میں کردی۔ جب حکیم الامت تک یہ مژدہ پہنچا ہے تو آپ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی اور بے ساختہ زبان سے نکل گیا کہ "وعلیک السلام یا نبی اللہ"۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ آج تو دن بھر صرف درود شریف ہی پڑھوں گا اور باقی سب کام بند!!

اس سے حکیم الامت کی شانِ عالی اور عنداللہ آپ کی مقبولیت ومحبوبیت عیاں ہے۔

علالت ورحلت

رشد وہدایت کا وہ آفتاب جو ۱۲۸۰ھ میں مطلع تھانہ بھون سے نمودار ہوا اور ۱۳۱۵ھ سے دنیا میں شریعت وطریقت کا انوار پھیلاتا رہا، بالآخر ۱۳۶۲ھ میں ہمیشہ کے لئے نظروں سے چھپ گیا۔

تاریخ وفات سے شاید پانچ برس پہلے ہی سے معدہ وجگر نے عاجز کر رکھا تھا کبھی قبض ہوتا تو ہٹنے کا نام نہ لیتا اور کبھی اسہال ہونے لگتے تو ہوتے ہی چلے جاتے، مختلف اعضا ورم کر گئے، علاج برابر ہوتا رہا اور حق تعالیٰ کی اس امانت کی حفاظت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی مگر تدبیر ہی تو بندہ کے اختیار میں ہے اور ایسے ہی موقعوں پر تو اس کا اختیار اور اس کی مجبوری سمجھ میں آتی ہے چنانچہ ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔'' بالآخر بھوک بھی تقریباً بند ہوگئی نحیف وناتواں اور صاحبِ فراش ہوگئے۔ اکثر غنودگی کی کیفیت طاری رہنے لگی مگر جب بھی ہوش آتا اور جتنی دیر بھی قائم رہتا اپنے عارفانہ کلمات اور حکیمانہ جوابات سے حاضرین وغائبین کو تقریر وتحریر سے مستفیض فرماتے، انہی باتوں کو دیکھ دیکھ کر یہ عقدہ کھلا کہ یہ غنودگی کے دورے نہ تھے بلکہ ''ربودگی'' و''استغراق'' کی کیفیات تھیں۔ ورنہ کسی کی عقل مان سکتی ہے کہ اس درجہ کے ضعف میں بار بار کے دوروں کے باوجود عقل وفکر کچھ بھی متاثر نہ ہو۔

مثلاً دیکھئے کہ عین اس چل چلاؤ کی حالت میں (۳۰۰) روپیہ کا ایک منی آرڈر آیا اس میں لکھا تھا:

''میں نے ایک منت مانی تھی کہ اگر کاروبار میں کامیابی ہوگی تو تین سو روپیہ حضرت والا کی خدمت میں بھیجوں گا۔ چنانچہ حسبہ مرسل خدمت ہیں، آپ مالک ہیں جہاں

چاہیں صرف فرمائیں۔

اس کا جواب آپ نے اپنی ناتوان انگلیوں سے بہ دقت تمام یہ تحریر فرمایا:

''پہلے تو تم نے لکھا ہے کہ ''آپ مالک ہیں'' بعد کو اختیار خرچ کرنے کا دیا ہے۔ اور یہ صیغہ ''توکیل'' کا ہے۔ چوں کہ مالک بنانے اور وکیل بنانے میں شرعاً فرق ہے، لہٰذا واپس کیا جاتا ہے۔''

حفظ شریعت کا ایسا خیال اور اس کا اتنا اہتمام کسی غائب دماغ سے ممکن بھی ہے؟

بنگال سے ایک معتقد با اخلاص کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب نبی کی وفات کا وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اختیار دیتے ہیں کہ خواہ وہ دنیا میں رہنا پسند کرے یا اللہ تعالیٰ کے یہاں جانا یہ تمہید لکھ کر اس میں لکھا تھا کہ میرے اعتقاد میں نبی ﷺ کے متبعین خاص کو بھی اس اختیارِ خاص سے حسب استعداد حصہ ملتا ہوگا۔ اس لئے عرض ہے کہ ہم ناقصوں کی تربیت کیلئے حضرتِ والا چند روز اور اس دنیا میں قیام منظور فرمائیں، خط کے جواب میں لکھوا دیا:

''تم اپنے دماغ کا کسی حاذق طبیب سے علاج کراؤ'' پھر حاضرین سے خطاب کر کے فرمایا۔ ''اول تو یہ ثابت نہیں کہ جو انبیاء علیہ السلام کو ملتا ہے اس میں اولیاء و مشائخ کو بھی حصہ ضرور ہی ملتا ہے۔'' اور اسکے بعد فرمایا ''اور اگر ایسا ہے بھی تو ان انبیاء نے کیا لیا؟'' (یعنی اللہ تعالیٰ کے قرب ہی کو دنیا پر ترجیح دی)۔

اسی حالت میں آپ نے اپنے مرید رشید خواجہ عزیز الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مجذوب سے متعلق فرمایا کہ ان کا ایک شعر مجھے اس درجہ پسند آیا کہ اگر میرے پاس ایک لاکھ روپیہ بھی ہوتا تو اس کے عوض دے دیتا اور پھر بڑے مؤثر انداز میں یہ شعر پڑھا۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

مرض الموت کے دن گزرتے گئے، دوشنبہ ۱۵ رجب ۱۳۶۲ھ کو صبح سے مسلسل دست

آنے لگے۔ کمزری ونقاہت نے رفع حاجت کے لئے بستر چھوڑنے کی طاقت بھی نہ رکھی تھی، لاچار بار بار کپڑے بدلے جاتے رہے خود صاحبِ مرض کو صفائی وطہارت، نماز و ادائی حقوق کا اہتمام تادم آخر برابر رہا۔ اسی دوشنبہ کو بعد مغرب اپنی چھوٹی اہلیہ سے پوچھا ''میں دونوں کا ماہوار خرچ دے چکا ہوں؟''

تسلی دی گئی۔ ''ہمیں بہت کچھ مل چکا ہے، آپ دے چکے ہیں بےفکر رہیں''۔

پھر فرمایا ''آج تو ہم جا رہے ہیں۔''

اہلیہ نے عرض کی ''کہاں؟''...... ارشاد ہوا ''تم نہیں جانتیں؟''...... اسکے بعد جو غشی طاری ہوئی تو سوا گھنٹہ تک طاری رہی۔ سانس تیز آواز سے چلتی رہی جب سانس اوپر آتی تو کتنی دیکھنے والیوں نے دیکھا کہ آپ کی درمیانی شہادت کی انگلی کے بیچ میں ہتھیلی کی پشت سے ایک ایسی روشنی نکلتی تھی کہ جلتے ہوئے برقی قمقمے اس کے سامنے ماند پڑ جاتے تھے۔ یہ روشنی سانس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ آتی جاتی رہی اور جب وہ ختم ہوئی تو یہ بھی غائب ہوگئی۔

کیا عجب کہ جن انگلیوں سے حقایق ومعارف ایک عرصہ تک معرض تحریر میں آتے رہے، یہ نور اسی کا ہو!

بہرکیف محفل دوشین کا وہ چراغ جو کئی برس سے مرض کے تندوتیز جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل سنبھل جاتا تھا۔ بالآخر سہ شنبہ کی شب (یعنی ۱۶، ۱۷ رجب ۱۳۶۲ھ م ۱۹، ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی رات، ۸۲ سال ۳ ماہ، ۱۱ دن کی ضوفشانی کے بعد ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

اس سانحۂ عظیم کی اطلاع ہوا کی طرح پھیل گئی اور برق بن کر علماء وعشاق کے قلوب پر گری، صبح ہوتے ہوتے ہزاروں محبت کے مارے جو پہلے کس مسرت وجوش سے اور کن کن امنگوں اور آرزوؤں کو لئے چلے آتے تھے، آج حسرت میں غرق فریادی اشکوں کے ساتھ سمٹ آئے، تھانہ بھون کی تسکین گاہ آج الم کدہ بن گئی!

سہارنپور اور دوسرے شہروں سے اسپیشل ٹرینیں آئیں اور ہزاروں شیدائیوں کے ساتھ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا جنازہ نکلا۔ ع

''عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے''

عیدگاہ میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور پھر آپ ہی کے وقف کردہ تکیہ میں جس کا تاریخی نام ''قبرستانِ عشق بازاں'' تھا اس عاشق بامراد کے جسم ناسوتی کو پیوند خاک کر دیا گیا۔

سارے ملک میں کہرام مچا اور ساری بڑی بڑی درسگاہوں اور خانقاہوں میں اس رحلت سے اداسی چھا گئی کہ ''موت العالِم موت العَالَم'' (عالم کی موت دنیا کی موت ہے)!

ملک کے سربرآوردہ اخباروں اور رسالوں میں حکیم الامت کے علمی و عملی کارناموں اور آپ کے فیوض برکات پر متعدد مضامین نکلے!

حضرت رحمۃ اللہ کے منتسبین سے متعلق یہ بات حاجی محمد عثمان خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مالک کتب خانہ اشرفیہ) کی زبانی احقر نے سنی ہے کہ جو حضرات شریک جنازہ تھے ان کو پھر بھی جلد آرام وسکون میسر آیا لیکن جن کو محرومی رہی ان کی آتشِ فراق ایک عرصہ بعد جا کر فرو ہوئی۔

اے آتش فراقت جا نہا کباب کردہ!

اب ذیل میں وہ پر اثر نظم درج کی جاتی ہے جو حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ کی رحلت پر کہی ہے، اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں رنج والم کی گھٹاؤں میں فیوض شیخ کے بقاء کی پر امید ہوائیں چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، طبیعت کا یہ کمالِ اعتدال حکیم الامت کے ایک خلیفۂ مجاز اور ان کے ہم رنگ وہم مذاق ہی میں پایا جاسکتا ہے:

رحلتِ شیخ

داغ فراق یار مٹایا نہ جائے گا — اب دل کا یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

حرفِ دم [1] وداع خدا کے سپرد ہو — تا آخر حیات بھلایا نہ جائے گا

---

[1] صاحب نظم رحمۃ اللہ علیہ، حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی وفات سے (بقیہ اگلے صفحے پر)

خیالِ سرِ بالیں

دل بھر کے دیکھ لو یہ جمال جہاں فروز پھر یہ جمالِ نور دکھایا نہ جائے گا
گوشِ جہاں بغور سنے اس کلام کو پھر یہ کلامِ شوق سنایا نہ جائے گا
اے میکشو یہ درد و تہہ جام بھی پیو ترسو گے پھر یہ جام پلایا نہ جائے گا

☆

اے دلِ خموش صبر و رضا کا مقام ہے نقشِ دوامِ فیض مٹایا نہ جائے گا
پیرِ مغاں نہیں ہے مگر میکدہ تو ہے جام و سبو یہاں سے ہٹایا نہ جائے گا
یونہی بچھا رہے گا یہاں خوانِ فیضِ عام جب تک ہیں میہمان بڑھایا نہ جائے گا

چاہا خدا نے تو تری محفل کا ہر چراغ
یونہی جلا کرے گا، بجھایا نہ جائے گا

مرتبۂ شہادت سے سرفرازی

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد انہی کے ایک مجاز نے خواب میں دیکھا کہ شیخ فرمارہے ہیں کہ مجھ کو مرتبۂ "شہادت" ملا۔ یوں تو بیسیوں بشارتیں ہیں جو اہلِ اخلاص کو عالم رؤیا میں سنائی گئی لیکن ان سب میں سے اس ایک کو یہاں نقل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ

ایک ہفتہ پہلے (۷ و ۱۱ جولائی ۱۹۴۳ء کے درمیان) حاضر خدمت تھے، سرکار بھوپال کی ایک ضروری دعوت پر بھوپال جانے پر مجبور تھے۔ ۱۱ جولائی ۱۹۴۳ء کو صبح کی مجلس کے بعد رخصت کی درخواست پیش کی تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بایں ہمہ ضعف قوت لیٹے ہی لیٹے دونوں ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھائے اور فرمایا "جاؤ خدا کے سپرد کیا"۔

[1] مذکورہ موقع ہی پر حضرت سیدی رحمۃ اللہ علیہ جب مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت نے اپنی محبت سے اپنے سرِ بالیں ایک کرسی پر بیٹھنے کا امر فرمایا حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر غنودگی یا استغراق کا عالم بار بار طاری ہو جاتا تھا اور آنکھیں بند فرمالیتے تھے، صاحب نظم مدظلہٗ اپنے رومال سے مگس رانی کرتے رہے، اسی عالم میں یہ خیالات ان کے دل و دماغ میں گزرتے رہے۔ (ملاحظہ ہو مضمون "موت العالِم موت العالَم" مشمولہ یادِ رفتگاں)

''مرتبۂ شہادت'' کی بشارت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک قول سے عین قرین عقل معلوم ہوتی ہے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے عمل سے اسکی توثیق ہوتی ہے۔شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں جہاں امتِ محمدیہ ﷺ کے اہلِ کمال کے تفاوت درجات کی بحث کی ہے وہاں تحریر فرماتے ہیں کہ ''شہید'' وہ لوگ ہیں جو انسانوں کی رہبری کیلئے معین ہوتے ہیں، ملاء اعلیٰ کی طرح کافر پر لعنت کرتے ہیں اور ایمان والوں سے خوش ہوتے ہیں، نیک امور کی ہدایت کرتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے رہتے ہیں اور نبی ﷺ کے ذریعہ سے اسلام کو غالب کرتے رہتے ہیں، جب روز قیامت ہوگا تو یہی کافروں سے خصومت کرنے کو مستعد ہوں گے اور ان کے کفر کی شہادت دینگے۔ یہ لوگ پیغمبر ﷺ کی بعثت میں بمنزلہ اعضاء کے ہوا کرتے ہیں تا کہ جو بعثت سے مقصود ہو وہ ان کے ذریعہ سے تکمیل کو پہنچ جائے اسی لئے ان کو اوروں سے افضل جاننا اور ان کی عزت وتوقیر کرنا واجب ہے۔''

باب دوم

آثارِ علمیہ[1]

[1] ”حکیم الامت کے آثارِ علمیہ“، ”معارف“ صفر ۱۳۶۳ھ م فروری ۱۹۴۴ء

جامعیتِ آثار

''حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و دینی فیوض و برکات اس قدر مختلف الانواع ہیں کہ ان سب کا احاطہ ایک مختصر سے مضمون میں نہیں ہو سکتا۔اور یہی ان کی جامعیت ہے جو انکے اوصاف و محامد میں سب سے اول نظر آتی ہے۔

وہ قرآن پاک کے حافظ ہیں مترجم ہیں، مجود ہیں مفسر ہیں، اس کے علوم و حکم کے شارح ہیں، اسکے شکوک و شبہات کے جواب دینے والے ہیں، وہ محدث ہیں، احادیث کے اسرار و نکات کے ظاہر کرنے والے ہیں۔ وہ فقیہ ہیں، ہزاروں فقہی مسائل کے جوابات لکھے ہیں، نئے سوالوں کو حل کیا ہے، نئی چیزوں کے متعلق انتہائی احتیاطوں کے ساتھ فتوے دیئے ہیں، وہ خطیب تھے، خطبِ ماثورہ کو یکجا کیا ہے، وہ واعظ تھے ان کے سینکڑوں وعظ چھپ کر عام ہو چکے ہیں۔ وہ صوفی تھے تصوف کے اسرار و غوامص کو فاش کیا ہے۔ ان کی مجلسوں میں علم و معرفت اور دین و حکمت کے موتی بکھیرے جاتے تھے، اور یہ موتی جن گنجینوں میں محفوظ ہیں، وہ ملفوظات ہیں۔ جن کی تعداد بیسیوں تک پہنچی ہے۔ وہ ایک مرشد کامل تھے، ہزاروں مسترشد و مستفیدان کے سامنے اپنے احوال و واردات پیش کرتے تھے، اور وہ ان کے تسکین بخش جوابات دیتے تھے، اور ہدایات بتاتے تھے، جن کا مجموعہ ''تربیۃ السالک'' ہے۔ انہوں نے بزرگوں کے احوال و کمالات کو یکجا کیا۔ اور اس ذخیرہ سے سب کو آشنا کیا، ان کی متعدد کتابیں اس مضمون پر ہیں انہوں نے حضرات چشت کے احوال و اقوال میں بظاہر اعتراض کے قابل باتوں کی حفاظت ظاہر کی اور اس کی تاویلات کیں، ان کی کتابوں کے خلاصے، اقتباسات اور تسہیلات ان سے الگ ہیں، جن کی ترتیب ان کے مسترشدوں نے کی ہے۔'' وہ مصلح امت تھے۔

امت کے سینکڑوں معائب کی اصلاح کی، رسوم و بدعات کی تردید، اصلاح و رسوم اور انقلاب حال پر متعدد تصانیف کیں۔ وہ حکیم امت تھے، مسلمانوں کے علاج اور نشاۃ احیاء پر ''حیٰوۃ المسلمین'' اور ''صیانۃ المسلمین'' وغیرہ رسائل تالیف فرمائے غرض ان کی زندگی میں مسلمانوں کی کم کوئی ایسی مذہبی ضرورت ہوگی جس کا مداوا اس حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زبان وقلم سے نہیں فرمایا، اور جس کی وسعت کا اندازہ تحقیق اور مطالعہ کے بعد ہی نظر میں آسکتا ہے۔

ان کی تصنیفات ہندوستان کے پورے طول و عرض میں پھیلیں اور ہزاروں مسلمانوں کی صلاح و فلاح کا باعث ہوئیں۔ اردو عربی کے علاوہ مسلمانوں نے اپنے ذوق سے ان کی متعدد تصانیف کا ترجمہ غیر زبانوں میں بھی کیا، چنانچہ متعدد کتابوں کے ترجمے انگریزی، بنگالی، گجراتی اور سندھی میں شائع ہوئے۔

ان تصانیف کی تعداد جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم تصانیف سب داخل ہیں آٹھ سو کے قریب ہے ۱۳۵۴ھ میں ان کے ایک خادم مولوی عبدالحق صاحب فتحپوری نے ان کی تصانیف کی ایک فہرست شائع کی تھی جو بڑی تقطیع کے پورے ۸۶ صفحوں کو محیط ہے، اس کے بعد کے نو برسوں میں جو رسائل یا تصانیف ترتیب پائیں وہ ان کے علاوہ ہیں کہا جاتا ہے کہ ہر صدی کا مجدد اپنی صدی کے کمالات کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے اگر یہ سچ ہے تو یہ صدی جو مطبوعات و منشورات کے کمالات سے مملو ہے اور جس کا اہم کارنامہ خواہ حق کے اثبات و اظہار میں ہو یا باطل کی نشر و اشاعت میں، پریس اور مطبع ہی کی برکات ہیں۔ زبان و قلم اس صدی کے مبلغ ہیں اور رسائل و منشورات دعوت کے صحیفے ہیں، اس بنا پر مناسب تھا کہ صدی کے مجدد کی کرامت بھی انہی کمالات میں جلوہ گر ہو۔

علمائے اسلام میں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں، جن کی تصانیف کے اوراق اگر ان کی زندگی کے ایام پر بانٹ دیئے جائیں تو اوراق کی تعداد زندگی کے ایام پر فوقیت لے جائے، امام جریر طبری، حافظ خطیب بغدادی امام رازی، حافظ ابن جوزی، حافظ سیوطی

وغیرہ متعدد نام اس سلسلہ میں لئے جا سکتے ہیں، ہندوستان میں مولانا ابوالحسنات عبدالحیٔ فرنگی محلی اور نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے نام بھی اس سلسلہ میں داخل ہیں، اس سلسلہ کا اخیر نام مولانا تھانوی علیہ الرحمۃ کا ہے۔

مولانا کی تصانیف کے انواع

مولانا کے رسائل اور تصانیف کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے، مگر ان میں چھوٹے چھوٹے رسالے بھی جن کو نئی اصطلاح میں مضامین ومقالات کہتے ہیں، داخل ہیں۔ ان میں بعض اتنے مختصر ہیں کہ صرف صفحے دو صفحے میں ہیں۔ بعض ایسے ضخیم ہیں کہ کئی کئی جلدوں میں ہیں۔

زبان

بیشترِ تصانیف نثر میں اور اردو زبان میں ہیں، البتہ بارہ تیرہ رسائل وکتب عربی زبان میں ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ سبق[۱] الغایات فی نسق الآیات۔ انوار الوجود[۲]۔ التجلی العظیم[۳]۔ حواشی تفسیر[۴] بیان القرآن۔ تصویر[۵] المقطعات۔ التلخیصات[۶] العشر۔ ماء تہ دروس[۷]۔ الخطب[۸] الماثورہ۔ وجوہ[۹] المثانی۔ سبع سیارہ[۱۰]، زیادات[۱۱]، جامع الآثار[۱۲]۔ تائید الحقیقۃ[۱۳] اور تین فارسی ہیں: مثنوی[۱] زیروبم۔ تعلقات[۲] فارسی۔ عقاید[۳] بانی کالج۔

نظم ونثر

نظم میں مولانا کی تصنیف صرف یہی ایک ''مثنوی زیروبم'' ہے اور یہ طالب علمی کے بعد ہی لکھی ہے۔ بظاہر اس میں ایک بیوقوف عاشق اور چالاک معشوق کا قصہ ہے۔ مگر درحقیقت یہ نفسِ انسانی کی بصیرت افروز حکایت ہے۔ ایک اور نظم اورادِ رحمانی کے آخر میں ہے۔

مولانا کو فارسی کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ حافظ اور مولانا رومی کے اشعار بیشتر نوک زباں تھے اور نظم کا ملکہ اور سلیقہ بھی تھا مگر کبھی اس سے کام نہیں لیا۔ ایک دفعہ میں نے اپنے

برادر گرامی قدر مولوی مسعود علی صاحب (ندوی) کو جو تھانہ بھون میں مقیم تھے۔ اپنے حاضر ہونے کی قصد سے مطلع کیا اور ریاض مرحوم کا یہ مصرعہ لکھدیا۔ ع

زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا

برادر موصوف نے یہ اطلاع مولانا کو دی اور یہ مصرعہ بھی سنادیا تو فوراً ''فقیروں'' کو بدل کر یوں فرمایا:

زندگی ہے تو سلیماں کا بھی پھیرا ہوگا

ایک دفعہ حضرت نے خاکسار کو ایک تسبیح عنایت فرمائی تو خاکسار نے ایک بیت کہی۔

خواجہ بخشید مراسبحۂ صد دانہ بلطف
دانہ اند اخت و در حلقہ مرا کرد اسیر

وصل مرحوم نے موقع سے حضرت کو یہ سنادیا، تو فرمایا ''تو بھئی مجھے بھی اس کا جواب لکھنا پڑے گا۔'' مگر کچھ فرمایا نہیں۔ سب سے آخیر میں جب خاکسار نے ازخود، حضرت کی تحریک اور اشارے کے بغیر اپنے احساس سے مجبور ہو کر رجوع و اعتراف کا مضمون معارف میں شائع کیا اور ملاحظہ کے لئے بھیجا تو بہت مسرت ظاہر فرمائی اور مثنوی کے وزن پر دس بارہ شعر لکھ کر بھیجے۔ جو اس ہیچ میرز کے لئے وجہ سعادت ہیں۔ یہ غالباً آخری نظم کی تصنیف ہے۔ اور اس کا نام بھی حضرت نے رکھدیا ہے۔[1]

موضوعاتِ نثر

تصانیف کا بیشتر حصہ اصلاحی اور فقہی ہے اور کمتر درس کے متعلق تاہم دو چار درسی

---

[1] وہ نظم یہ ہے:

اعتراف (یعنی اخذ اعلان) از اعتراف (یعنی رجوع سید سلیمان)
لمثل ھذا فلیعمل العاملون وفی ذالک فلیتنا فس المتنافسون
(اقتباس ترغیب دلپذیر، از مثنوی رومی تبصرف یسیر)

از سلیماں گیر اخلاصِ عمل واں تو ندوی راغزہ از دغل
اے دلت معمور از اسرارِ حق اے دلت مخمور از آثارِ حق

(بقیہ اگلے صفحے پر......)

کتابوں پر بھی رسائل ہیں، مذہبی تصانیف میں علوم القرآن، علوم الحدیث، کلام وعقاید، فقہہ وفتاویٰ، اور سلوک وتصوف اور مواعظ اکثر ہیں۔

قرآن پاک کی خدمت

اسلام میں علم کا سب سے پہلا سفینہ خود اسلام کا صحیفہ ہے یعنی قرآن پاک، مولانا نے اس کی خدمت کی سعادت جس جس نوع سے حاصل فرمائی وہ بجائے خود ان کی ایک علمی کرامت ہے۔ کانپور کے زمانہ قیام میں مطبع انتظامی میں تشریف رکھتے تھے وہاں جرامت اولین مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا جن کو آنحضرت ﷺ نے اللّٰھم علم الکتاب کی دعا دی تھی اور بشارت سنائی تھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ اس رویا کے بعد سے میری مناسبت قرآنی بہت بڑھ گئی تھی اور یہ رویا اسی کی طرف اشارہ تھا۔

قرآن پاک کی خدمت کی یہ سعادت نہ صرف معنوی حیثیت سے حاصل فرمائی بلکہ

بشارت

اے دلت پر نور از انوارِ حق　　اے دلت مسرور از اخبارِ حق

دُعا

صد مبارک باد ایں اظہارِ حق　　صد مبارک باد ایں اقرارِ حق

مشورہ

لیک باشد اس طریق نفع خاص　　کہ بہ اہلِ علم وارد اختصاص

سعی نفع عام اینجا واجب است　　آنکہ نافع بہر ہر ہر طالب است

تفسیر نفع عام

در کلامِ خود نظر خود کردنی　　یا کہ نقادے بدست آوردنی

ہمچناں کردم بہ تالیفات خویش　　صرف ہم کردم پئے او نقد بیش

معذرت

گرچہ ناظم نیتم ابیات را　　نثر کردم لیک ایں جذبات را

مقصد من خیر خواہی ہست و بس　　بو کہ بار غبت فتد در گوش کس

(بقیہ اگلے صفحے پر......)

لفظ و معنی دونوں حیثیتوں سے وہ حافظ تھے اور بڑے جید حافظ و قاری تھے۔ اور فنون و تجوید و قرأت کے بڑے ماہر، اخیر زمانہ میں پانی پت کو قاری عبدالرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ پانی پتی کی برکت سے قرأت سے ایک خاص مناسبت حاصل ہوگئی تھی۔ مولانا ایک دفعہ جب پانی پت گئے تو لوگوں نے ان کو بالقصد کسی جہری نماز کا امام بنادیا، مولانا نے بے تکلف کسی تصنع کے بغیر ایسی قرأت فرمائی کہ قاریوں نے تعریف کی کہ صحت مخارج کے ساتھ تکلف کے بغیر اس قدر موثر قرأت نہیں سنی۔ ایک اور مقام پر جہاں اہلِ نظر موجود تھے صبح کی نماز پڑھائی تو ایک صاحب نے کہا کہ موسیقی کے قاعدہ سے آپ کی قرأت میں بھیرویں کی کیفیت تھی جو صبح کی ایک سہانی راگنی کا نام ہے۔

مولانا کی قرأت کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مخارج کی پوری صحت ہوتی تھی لیکن

چنانچہ حضرت سیدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سیرت النبی ﷺ کی جلدوں پر نظر ثانی کی۔
اشرف علی ۲۷ محرم ۱۳۶۱ھ۔

تو صرف دو مسائل میں رجوع کرنا پڑا ایک تو معراج کا مسئلہ جس میں پہلے رجحان امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف تھا اور دوسرے خلود فی النار کا مسئلہ۔

نظم تو آخری یہی ہے۔ البتہ وفات سے چند ہی روز پہلے ایک شعر اور ہوا ہے، مشہور شاعر جگر مرادی نے اپنی ایک فارسی غزل جو خود ان کو بھی بہت پسند تھی۔ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عقیدت مندانہ لکھ کر بھیجی جس کا ایک مصرعہ یہ تھا۔ ع

نہ یہ مطربے، نہ یہ شاہدے، نہ یہ حاصل غبنی خوشم!

آپ نے اس کے جواب میں لکھا۔ آپ کے اور رنگین جذبات نے میرے ایک خشک جذبہ کو حرکت دیکر مجھ سے بھی ایک شعر کہلوایا جس کو ایک اہلِ کمال کے سامنے پیش کرنا اس لئے مناسب نہیں کہ ایک صورت دعوی کی سی ہے۔ لیکن بامید نفع پیش کرتا ہوں۔ گو وہ شعر رنگین نہیں مگر سنگین ہے ؎

نہ یہ نظمِ شاعر خوش غزل، نہ بہ نثر ناثر بے بدل   بہ غلامی شہ عزوجل، و بعاشقی نبی ﷺ خوشم

اس شعر کو لکھ کر اس کے حاشیہ پر عربی میں یہ عبارت تحریر فرمائی۔ ''**خاتمة الجذبات ولتكن اخر الحالات**'' (یعنی سارے جذبات کا ختم کردینے والا یہ جذبہ ہونا چاہئے اور سارے حالات کے بعد آخری حال یہ ہونا چاہئے)   فقط   (از خاتمۃ السوانح)

لہجہ میں قاریوں کی بناوٹ نہ تھی اور نہ تحسین آواز کے لئے بہ تکلف اتار چڑھاؤ ہوتا تھا۔ بلکہ فطری آواز بلا تکلف حسب موقع گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور تاثیر میں ڈوب کر نکلتی تھی، کہ "ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔" ا

ا۔ تجوید و قرأت و متعلقاتِ قرآنی

علوم القرآن میں سے یہ پہلا فن ہے، مولانا نے اس پر حسب ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں۔

ا۔ **جمال القرآن:** یہ فن تجوید کا رسالہ ہے، جس میں قرآن مجید کو ترتیل اور تجوید سے پڑھنے کے مسائل ہیں، مخارج اور صفات حروف اظہار و اخفاء، ابدال و ادغام و تفخیم و ترتیق، وقف و وصل کے مسائل درج فرمائے ہیں۔

۲۔ **تجوید القرآن:** اس مختصر منظوم رسالہ میں بچوں کی یاد کیلئے تجوید کے عام مسائل لکھے ہیں۔

۳۔ **رفع الخلاف فی حکم الاوقاف:** اوقاف قرآنی کے بارے میں قاریوں میں جو اختلاف ہے، اس رسالہ میں اس کی توجیہ و تطبیق کی صورت بیان کی گئی ہے۔

۴۔ **وجوہ المثانی:** اس میں قرآن شریف کی مشہور قرأتوں کے اختلاف کو قرآن پاک کی سورتوں کی ترکیب سے سلیس عربی میں جمع فرمایا ہے۔ اور آخر میں تجوید و قرأت کے کچھ قواعد تحریر فرمائے ہیں۔

۵۔ **تنشیط الطبع فی اجراء السبع:** قرأت سبع اور اس فن کے رواۃ کی تفصیل درج کی گئی ہے۔

۶۔ **زیادات علی کتب الروایات:** اس میں قرأت کی غیر مشہور روایتوں کی سندیں ہیں یہ "وجوہ المثانی" کے آخر میں بطور ضمیمہ ہے۔

۷۔ **ذنابات لمافی الروایات:** یہ اگلے رسالہ کا ضمیمہ ہے۔

۸۔ **یادگار حق القرآن:** اس میں قرآن مجید کے آداب اور تجوید کے مسائل کا مختصر بیان ہے۔ یہ "تجوید القرآن" کا اختصار و ضمیمہ ہے۔

۹۔ **متشابہات القرآن لتراویح رمضان:** قرآن پاک کے حفاظ کو تراویح میں قرآن

سنانے میں بعض مشہور مقامات پر جو متشابہات لگتے ہیں، ان سے بچنے کے لئے اس میں چند قواعد کلیہ یعنی گر بعض آیات کے ضبط فرمائے گئے ہیں۔

۱۰۔ آداب القرآن: قرآن پاک کی تلاوت کے آداب اور تلاوت کرنے والوں کی کوتاہیوں کی اصلاح کے لئے ہدایات وتنبیہات ہیں۔

۲۔ ترجمہ وتفسیر قرآن

۱۔ ترجمہ: قرآن پاک کا سلیس و بامحاورہ اردو ترجمہ جس میں زبان کی سلاست کے ساتھ بیان کی صحت کی احتیاط ایسی کی گئی ہے۔ جس سے حقیر کی نظر میں بڑے بڑے تراجم خالی ہیں۔ قرآن پاک کا سب سے صحیح اردو ترجمہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے۔ لیکن وہ بہت ہی لفظی ہے اس لئے عام اردو خوانوں کے فہم سے باہر ہے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ترجمہ میں دونوں خوبیاں یکجا ہیں، یعنی ترجمہ صحیح اور زبان فصیح ہے، اس ترجمہ میں ایک خاص بات اور ملحوظ رکھی گئی ہے کہ اس زمانہ میں کم فہمی یا ترجموں کی عدم احتیاط کی وجہ سے جو شکوک قرآن پاک کی آیات میں عام پڑھنے والوں کو معلوم ہوتے ہیں ان کا ترجمہ ہی اس میں ایسا کیا گیا ہے کہ کسی تاویل کے بغیر وہ شکوک ہی ان ترجموں کے پڑھنے سے پیش نہ آئیں اور پھر قرآن پاک کے لفظوں سے عدول بھی نہ ہونے پائے۔ اسی لئے کہیں کہیں مزید تفہیم کی غرض سے قوسین میں ضروری تفسیری الفاظ بھی بڑھائے گئے ہیں یہ مولانا کی عظیم الشان خدمت ہے۔

۲۔ تفسیر بیان القرآن: یہ بارہ جلدوں میں قرآن پاک کی پوری تفسیر ہے، جس میں ڈھائی سال کی مدت میں مولانا نے تمام فرمایا ہے۔ اس تفسیر کی حسب ذیل خصوصیتیں ہیں:
سلیس و بامحاورہ، حتی الوسع تحت اللفظ، ترجمہ، نیچے "ف" کے اشارہ فائدہ سے آیت کی تفسیر، تفسیری روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے، فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔ لغات اور نحوی ترکیبوں کی تحقیق فرمائی گئی ہے، شبہات

اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے، صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کیے گئے ہیں، تمام کتب تفاسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ ذیل میں اہلِ علم کے لئے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے مشکلات حل کیے گئے ہیں اور حاشیہ پر عربی میں اعتبارات وحقایق و معارف الگ لکھے گئے ہیں، ماخذوں میں غالباً سب سے زیادہ آلوسی بغدادی حنفی کی تفسیر "روح المعانی" پر اعتبار فرمایا گیا ہے۔ یہ تفسیر اس لحاظ سے حقیقۃً مفید ہے کہ تیرھویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے۔" اس لئے تمام قدماء کی تصانیف کا خلاصہ ہے اور مختلف ومنتشر تحقیقات اس میں یکجا ملتی ہیں۔

عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اردو تفسیر صرف عوام اردو خوانوں کے لئے علماء لکھتے ہیں، یہی خیال مولانا کی اس تفسیر کے متعلق بھی علماء کو تھا، لیکن ایک دفعہ اتفاق سے مولانا کی یہ تفسیر مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اٹھا کر دیکھی تو فرمایا کہ میں سمجھتا تھا کہ اردو میں یہ تفسیر عوام کے لئے ہوگی مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے، خود میرا (یعنی علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کا) خیال یہ ہے کہ قدیم کتب تفسیر میں راجح ترین قول مولانا کے پیش نظر رہا ہے، ساتھ ہی ربط آیات وسور کا ذوق مولانا کو ہمیشہ رہا ہے اور اس کا لحاظ اس تفسیر میں بھی کیا گیا ہے مگر چونکہ ربط آیات کے اصول سب کے سامنے یکساں نہیں اس لئے وجوہ ربط میں قیاس اور ذوق سے چارہ نہیں اسلئے ہر مستند ذوق والے کے لئے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے اسی طرح مفسرین کے مختلف اقوال میں سے کسی قول کی ترجیح میں زمانہ کی خصوصیات اور ذوق ووجدان کا اختلاف بھی امر طبعی ہے اس لئے اگر کلام سلف کے اصول متفقہ سے دور نہ ہو تو تنگی نہ کی جائے۔

۳۔ چونکہ مسلمانوں پر شفقت اور ان کی اصلاح کی فکر مولانا پر بہت غالب تھی۔ اس لئے وہ ہمیشہ ان کو گمراہیوں سے بچانے میں بجان ودل ساعی رہتے تھے۔ اردو میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے جو ترجمے شائع ہوئے تھے وہ بالکل کافی تھے۔ مگر نئے زمانہ میں پہلے سر سید نے بضمن تفسیر اور پھر شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے اپنے اپنے ترجمے شائع کئے تو انہوں نے پہلی دفعہ یہ

کوشش کی کہ اپنے جدید عقائد کو پیش نظر رکھ کر ترجمے کریں، اولین توجہ زبان کی طرف رکھیں اور اقوال سلف کی پروا نہ کریں اس طرز عمل نے علماء کو مضطرب کر دیا اور ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ مولانا نے اپنا ترجمہ اسی ضرورت سے مجبور ہو کر کیا، مگر اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کے ترجمہ کو بغور پڑھا۔ اور اس کے اغلاط پر نشان دے کر ایک رسالہ اس ترجمہ کی اصلاح پر لکھا جس کا نام "اصلاح ترجمہ دہلویہ" ہے۔

۴۔ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ کی عام اشاعت نے دہلی کے ایک بلند بانگ اخبار نویس مرزا حیرت کو حیرت میں ڈال دیا اور انہوں نے پہلے تو ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمے پر اعتراضات شروع کئے اور پھر اپنا ترجمہ چھپوایا جس کی نسبت عام طور پر مشہور ہے کہ وہ لکھنؤ کے ایک عالم کا کیا ہوا ہے۔ لیکن نام سے وہ مرزا صاحب کے چھپا ہے، کیونکہ مرزا صاحب خود عربی سے نابلد تھے، بہرحال مولانا نے اس ترجمے کے اغلاط کی اصلاح پر بھی ایک رسالہ تالیف فرمایا۔ جس کا نام "اصلاح ترجمہ حیرت" ہے۔

۵۔ بعض معاصر علماء نے اردو میں قرآن شریف پر حواشی لکھے ہیں جن میں ربط آیات کا خاص طور سے اظہار کیا گیا ہے، اور آیات کو بہ تاویل واعتبار سیاسی مسائل پر منطبق کیا ہے، اور اس تاویل واعتبار میں کہیں کہیں اعتدال سے قلم باہر نکل گیا ہے، مولانا نے ان تاویلات بعیدہ پر تنبیہات لکھیں جن کا نام "التقصیر فی التفسیر" ہے۔

۶۔ لاہور کے ایک بزرگ نے قرآنی مطالب کو کئی جلدوں میں "تفصیل البیان فی مقاصد القرآن" کے نام سے جمع کیا ہے۔ اس کے مؤلف کی درخواست پر اس میں جو شرعی نقائص نظر آئے وہ مولانا نے "الھادی للحیران فی وادی تفصیل البیان" کے نام سے ظاہر فرمائے ہیں۔

۷۔ مولانا کے خاندان کی بعض لڑکیوں نے مولانا سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا تھا، اور اکثر آیات کی تفسیر وتقریر کو ضبط تحریر میں کر لیا تھا، وہ ایک مجموعہ ہو گیا اور اس کا نام

''تقریر بعض البنات فی تفسیر بعض الآیات'' رکھا مگر چھپا نہیں۔

۸۔''رفع البناء فی نفع السماء'': ''الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء' ' کی تفسیر جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آسمان سے کیا فائدے ہیں۔ یہ درحقیقت ایک سوال کے جواب میں ہے۔

۹۔احسن الاثاث فی نظر الثانی فی تفسیر المقامات الثلث: سورہ بقرہ کی تین آیتوں پر نظر ثانی فرمائی ہے۔

۱۰۔''اعمال قرآنی'' قرآن مجید کی بعض آیات کے خواص جو بزرگوں کے تجربہ میں آئے ان کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۱۔''خواص فرقانی'' اس کا موضوع بھی وہی ہے اس کا ایک اور حصہ ہے جس کا نام ''آثار تبیانی'' ہے۔ان رسائل سے مقصود عوام کو ناجائز غیر شرعی تعویز گنڈوں اور عملیات سفلی سے بچا کر قرآنی آیات کے خواص کی طرف ملتفت کرنا ہے، اور اس قسم کے بعض خواص احادیث میں بھی مروی ہیں۔

۳۔علوم القرآن

علوم القرآن کے مختلف مباحث و مسائل تو مولانا کی ساری تصانیف و مواعظ، ملفوظات اور رسائل میں ملتے ہیں۔اگر ان کو کوئی یکجا کر دے تو خاصی ضخیم کتاب ہو جائے۔ مگر ان پر مستقل طور پر بھی بعض کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ جن میں سے اول ''سبق انعایات'' ہے۔

ا۔''سبق انعایات فی نسخ الآیات'' یہ قرآن پاک کے آیات و سور کے ربط و نظم پر عربی میں پندرہ صفحوں کی کتاب ہے، جس کو ۱۳۱۶ھ میں ڈھائی مہینوں میں تصنیف فرمایا، اس میں مولانا نے سورۂ فاتحہ سے سورۂ الناس تک تمام سورتوں اور ان کی آیات کے ربط پر کلام فرمایا ہے، اور اس کا بڑا حصہ امام رازی کی ''تفسیر کبیر'' اور مفتی ابوالسعو د بغدادی المتوفی ۱۹۵۱ھ کی ''ارشاد العقل السلیم الیٰ ضرایا القرآن الکریم ''

سے ماخوذ و مستنبط ہے، جس کی تصریح کتاب کے دیباچہ میں کر دی گئی ہے، ان دو کے علاوہ مولانا نے خود اپنے اضافوں کو "قال المسکین" کہہ کر بیان فرمایا ہے۔ یہ حصہ بھی اچھا خاصہ ہے اور اخیر کی صورتوں میں زیادہ تر اضافات ہی ہیں جن میں مؤلف نے ان سورتوں کے موضوع اور عمود کی تعین فرمائی ہے۔ چونکہ یہ امور زیادہ تر ذوقی ہیں اسلئے ان ذوقیات کی نسبت ہمیشہ رائیں مختلف ہوسکتی ہیں، تاہم ان سے مولانا کے ذوق قرآنی کا اندازہ بہت کچھ ہوسکتا ہے تفسیر "البیان" میں بھی ربط و نظم پر گفتگو التزام کے ساتھ کی گئی ہے۔

ذوق ربط آیات: مولانا کے ذوق ربط آیات و سور کا حال چونکہ عام طور سے لوگوں کو معلوم نہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مواعظ میں سے دو قول نقل کر دیئے جائیں۔ جن سے ان کا ذوق اور ان کے بعض اصول ربط واضح ہو جائیں۔ سبیل النجاح ص ۹ میں فرماتے ہیں[1]

جواب اس شبہ کا کہ مفسرین کے بیان کردہ روابط مخترع ہیں کیونکہ خدائے تعالیٰ نے ان ارتباط کا لحاظ کیا ہی نہیں

"اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں باوجود طرز تصنیف اختیار نہ کرنے اور شفقت کا طرز اختیار کرنے کے پھر بھی ربط کا لحاظ کیا گیا ہے اس لئے مفسرین کے بیان کردہ روابط مخترع نہیں ہیں اور اس ربط کو ملحوظ فرمانے کی دلیل یہ ہے کہ احادیث سے ثابت ہے کہ ترتیب نزول آیات اور ہے اور ترتیبِ تلاوتِ مصحف اور ہے۔ یعنی قرآن کا نزول تو واقعات کے موافق ہوا کہ ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے متعلق ایک آیت نازل ہوگئی۔ پھر دوسرا واقعہ پیش آیا تو دوسری آیت نازل ہوگئی وعلیٰ ہذا تو ترتیب نزول تو حسب واقعات ہے۔ اگر تلاوت میں بھی یہی ترتیب رہتی تو واقعی ربط کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ترتیب تلاوت خود جناب باری تعالیٰ عزاسمہٗ نے بدل دی۔ یعنی حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی آیت کسی واقعہ کے متعلق نازل ہوتی۔ تو جبرئیل علیہ السلام بحکم خداوندی

---

[1] منقول ملخصاً اشرف الجواب لشفاء المرتاب حصہ سویم ص ۲۹۶ و ص ۲۹۷

حضور ﷺ سے یہ کہتے کہ آیت کو مثلاً سورۂ بقرہ کی فلاں آیت کے بعد رکھا جائے اور اس کو فلاں آیت کے بعد اور اس کو فلاں سورۃ کے ساتھ علی ہذا تو مصحف میں ترتیب آیات ترتیب نزول پر نہیں بلکہ اس کی ترتیب حق تعالیٰ نے دوسری رکھی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس آیت کو بھی کسی آیت کے ساتھ ملایا گیا ہے دونوں میں کوئی مستقل ربط اور مناسبت اور تعلق ضرور ہے کیونکہ اگر اب بھی دونوں میں کوئی ربط نہ ہو تو ترتیب نزول کا بدلنا مفید نہ ہوگا۔" (سبیل النجاح ص ۹)

پھر اسی کتاب کے ص ۶ میں ارشاد ہے[1]

قرآنِ کریم بے ترتیب اور غیر مرتبط کلام نہیں ہے

قرآن میں ہر پہلو کی ایسی رعایت ہے کہ کسی کلام میں ویسی رعایت نہیں ہے قرآن میں صرف ضابطہ کو پورا نہیں کیا گیا۔ اس مضمون کو آپ سہولت سے یوں سمجھیں گے کہ حکام دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو بعض ضابطہ کے پابند ہیں ضابطہ کی رو سے جو کام ان پر واجب ہے وہ کر دیا۔ اور قانون کے موافق رعایا پر احکام لازم کر دے ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ دشوار احکام کو قانون سے خارج کریں یا ان کے سہل یا آسان کرنے کی تدبیر بتائیں۔ دوسرے وہ حکام ہیں جن کو رعایا سے محبت ہوتی ہے اور مخلوق کو راحت پہنچانا چاہتے ہیں اور حتی الامکان قانون میں کوئی دشوار حکم داخل نہیں کرتے اور اگر کسی مصلحت سے کوئی دشوار حکم رکھتے بھی ہیں تو رعایا کو اس کے سہل کرنے کی تدبیر بھی بتلاتے ہیں اور اس تجویز میں ان پر تعب ضرور ہوتا ہے مگر یہ شفقت پر مبنی ہے اتنی رعایتیں وہی حاکم کر سکتا ہے جس کو رعایا پر شفقت ہو اسی طرح ایک اور مثال سمجھئے کہ نصیحت کرنے والا ایک تو استاد ہوتا ہے اور ایک باپ ہوتا ہے۔ باپ کی نصیحت میں عام لوگوں کی نصیحت سے فرق ہوتا ہے۔ استاد تو ضابطہ پُری کرتا ہے باپ ضابطہ پُری نہیں کر سکتا وہ نصیحت کرتے ہوئے اس کا خیال رکھتا ہے کہ بیٹے کو ایسے عنوان اور ایسے طرز سے نصیحت کروں

---

[1] منقول از اشرف الجواب لشفاء المرتاب حصہ سویم ص ۲۹۳ و ص ۲۹۶

جو اس کے دل میں گھر کرے۔ کیونکہ وہ دل سے یہ چاہتا ہے کہ اس کے بیٹے میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اور اگر وہ کوئی مشکل کام بھی بتلاتا ہے تو اس طریقہ کو وہ اختیار کرتا ہے جس سے بیٹے کو عمل آسان ہو جائے اور ان سب رعایتوں کا منشاء وہی شفقت ہے۔ شفقت ہی کے ساتھ تمام پہلوؤں کی رعایت کی جا سکتی ہے اور اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کے وقت بے ربط اور بے ترتیب بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً باپ بیٹے کو کھانا کھاتے ہوئے نصیحت کرے کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس مضمون پر وہ مفصل گفتگو کر رہا ہو اسی درمیان میں اس نے دیکھا کہ بیٹے نے ایک بڑا سا لقمہ کھانے کو لیا ہے تو وہ فوراً پہلی نصیحت کو قطع کر کے کہے گا کہ یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے۔ اس کے بعد پھر پہلی بات پر گفتگو شروع کر دے گا اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو وہ کہے گا کہ یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے بری صحبت سے منع کرنے میں لقمہ کا کیا ذکر مگر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ بے ترتیب کلام مرتب و مرتبط کلام سے افضل ہے۔ شفقت کا مقتضا یہی ہے کہ ایک بات کرتے ہوئے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو تو ربط کا لحاظ نہ کرے دوسری بات کو بیچ میں رکھ کر پہلی بات کو پورا کرے۔ یہی راز ہے اس کا کہ خدائے تعالیٰ کا کلام ظاہر میں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے اس ظاہری بے ربطی کا منشاء شفقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے کہ ایک مضمون پر کلام شروع ہو تو دوسرے باب کا کوئی مضمون اس میں نہ آسکے۔ بلکہ وہ ایک نئے مضمون کو بیان فرماتے ہوئے اگر کسی دوسرے امر پر تنبیہ کی ضرورت دیکھتے ہیں تو شفقت کی وجہ سے درمیان میں فوراً اس پر بھی تنبیہ فرما دیتے ہیں اس کے بعد پھر پہلا مضمون شروع ہو جاتا ہے چنانچہ ایک آیت مجھے یاد آئی جس پر لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا اعتراض کیا ہے سورۃ القیٰمہ میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے کہ انسان اس وقت بڑا پریشان ہوگا اور بھاگنے کا موقع ڈھونڈے گا اپنے اعمال پر اسے اطلاع ہوگی اس روز اس کو سب اگلے پچھلے کئے ہوئے کام جتلا دیئے جائیں گے، پھر فرماتے ہیں۔ بل الانسان علی

نفسہ بصیرہ ولو القی معاذیرہ ط (یعنی انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہ ہوگا بلکہ اس دن انسان اپنے نفس کے احوال و اعمال سے خوب واقف ہے کیونکہ اس وقت حقائق کا انکشاف ضروری ہو جائے گا۔ اگر چہ وہ (باقتضائے طبیعت) کتنے ہی بہانے بنائے جیسے کفار کہیں گے واللہ ہم تو مشرک نہ تھے۔ مگر دل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں غرض انسان اس روز اپنے سب احوال کو خوب جانتا ہوگا۔ اس لئے یہ جتلانا محض قطع جواب اور اتمام حجت اور دھمکی کے لئے ہوگا نہ کہ یاد دہانی کے لئے یہاں تک تو قیامت ہی کے متعلق مضمون ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔ لاتحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ و قرانہ فاذا قرأنہ فاتبع قرأنہ ثم ان علینا بیانہ

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن نازل ہوتے ہوئے اس کے یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے ہمارے ذمہ ہے آپ کے دل میں قرآن کا جما دینا اور زبان سے پڑھوا دینا۔ تو جب ہم قرآن نازل کریں اس وقت فرشتہ کی قرأت کا اتباع کیجئے پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپ قرآن کا مطلب بھی بیان کردیں گے۔ اس کے بعد پھر قیامت کا مضمون ہے۔ کلا بل تحبون العاجلۃ و تذرون الآخرۃ کہ تم لوگ دنیا کے طالب ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو پھر فرماتے ہیں۔ وجوہ یومئذ ناظرۃ الی ربھا ناظرہ ط بعض کے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے الخ تو لا تحرک بہ لسانک سے اوپر بھی قیامت کا ذکر ہے اور بعد کو اس کا ذکر ہے اور درمیان میں یہ مضمون ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کے لئے زبان کو حرکت نہ دیا کیجئے لوگ اس مقام کے ربط میں تھک گئے ہیں اور بہت سی توجہات بیان کی ہیں مگر سب میں تکلف ہے اور کسی نے خوب کہا ہے۔

"کلامے کہ محتاج یعنی باشد لا یعنی است"

تو جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضور ﷺ کے ساتھ ہے اس کو آفتاب کی طرح نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں کیا موقع ہے صاحبو! اس کا وہی موقع ہے جیسے وہ باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا۔ کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس کے مفاسد بیان کر رہا تھا کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا سا لقمہ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے تو ظاہر میں لقمہ کا ذکر ترتیب کلام سے بالکل بے ربط ہے۔ لیکن جو باپ ہوا ہوگا وہ جانے گا کہ نصیحت کرتے کرتے درمیان میں لقمہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ لڑکے نے بڑا لقمہ لیا تھا۔ باپ نے فرطِ شفقت سے درمیانِ کلام میں اس پر بھی تنبیہ کر دی۔ اس طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہے تھے اور حضور ﷺ اس خیال سے کہ کہیں یہ آیتیں ذہن سے نہ نکل جائیں۔ جلدی جلدی ساتھ ساتھ پڑھ رہے تھے تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرط شفقت سے اس کا بھی ذکر فرما دیا کہ آپ یاد کرنے کی فکر نہ کریں یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ آپ بے فکر ہو کر سنتے رہا کریں قرآن آپ کے دل میں خود بخود محفوظ ہو جائیگا۔ تو اس مضمون کو درمیان میں ذکر فرمانے کی وجہ فرط شفقت ہے۔ اور اس کا مقتضاء یہ تھا کہ اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہوتا تو بھی یہ بے ربطی ہزار ربط سے افضل تھی مگر پھر بھی باوجود اس کے یہاں ایک مستقل ربط بھی ہے اور یہ خدا کے کلام کا اعجاز ہے کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی کلام میں ربط موجود ہے۔ (سبیل النجاح ص ۲)

۲۔اشرف البیان لما فی علوم الحدیث والقرآن؛ مولانا کے چند مواعظ سے ان کے ایک معتقد وخادم نے ان اقتباسات کو یکجا کر دیا ہے جن میں آیات قرآنی اور احادیث کے متعلق لطیف نکات وتحقیقات ہیں افسوس ہے کہ اس کام کو اگر زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ کیا جاتا تو کئی حصے اس کے مرتب ہو سکتے تھے۔

۳۔''دلائل القرآن علی مسائل النعمان ''مولانا کو حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ سے جو شدید شغف تھا، وہ ظاہر ہے ان کا مدت سے خیال تھا کہ ''احکام القرآن'' ابوبکر حصاص رازی، اور ''تفسیرات احمدیہ'' ملاجیون کی طرح خاص اپنی تحقیقات اور ذوق قرآنی سے ان آیات اور ان کے متعلق مباحث و دلائل کو یکجا کر دیں جن سے فقہ حنفی کے کسی مسئلہ کا استنباط واخراج ہو، لیکن یہ کام انجام نہ پاسکا، آخر میں یہ خدمت اپنے مسترشد خاص مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کو سپرد فرمائی کہ وہ ان کی ہدایت کے مطابق اس کو تالیف فرمائیں، چنانچہ مفتی صاحب اس کام میں مصروف ہو گئے۔ابھی حال میں جب وہ مدرسہ سے الگ ہوئے تو خانقاہ امدادیہ میں جا کر خاص اس کام کی تکمیل میں لگ گئے، مولانا روزانہ کی مجلس میں اس کے متعلق جو جو نکتے ان کو یاد آتے جاتے، بیان فرماتے اور جناب مفتی صاحب اس کو اپنے مقام پر آکر قلمبند فرما لیتے یہ تصنیف اس طور سے جاری تھی کہ مولانا کا مرض الموت شروع ہوا اور کام ناتمام رہ گیا۔ امید ہے کہ مفتی صاحب اس کام کو جاری رکھیں گے اور انشاء اللہ اتمام کو پہنچائیں گے۔[1]

مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی روایت میں نے سنی ہے جن کو خود بھی ماشاء اللہ قرآن پاک کے فہم کا ذوق ہے، وہ نقل کرتے تھے کہ مجلس میں مولانا ان آیات پر جب گفتگو فرماتے تھے اور فقیہانہ وقت نظر سے کسی حنفی مسئلہ کی صحت پر استدلال کرتے تھے تو اچنبھا ہوتا تھا کہ یہ مسئلہ اس میں موجود تھا لیکن اب تک اس پر اس حیثیت سے نظر نہیں پڑی تھی۔ایسا معلوم ہوتا کہ بادل چھٹ گیا اور آفتاب نکل آیا۔اسی کے ساتھ وہ مفتی

---

[1] یہ کام الحمدللہ کہ انجام تو پا گیا ہے گو اب تک منظر عام پر نہیں آسکا! (مؤلف)

صاحب موصوف کے حافظہ کی تعریف کرتے تھے کہ مولانا سے سن کر اپنے مستقر پر پہنچ کر اسکو بعینہ اسی طرح قلمبند کرتے تھے جس طرح مولانا نے تقریر فرمائی تھی۔

۴۔تصویر المقطعات لتیسیر بعض العبارات ''تفسیر بیضادی میں حروف مقطعات کا جو مجمل و مغلق بیان ہے، اس رسالہ میں بزبان عربی اس کو آسان کر کے بیان کیا گیا ہے جس سے حروف مقطعات کی تاویل کا ایک طریق معلوم ہوتا ہے۔

۵:۶۔مولانا کے دو رسالے علم القرآن سے متعلق اور ہیں اور ان دونوں کا تعلق سلوک سے ہے ایک کا نام ''مسائل السلوک من کلام ملک الملوک اور دوسرے کا نام تائید الحقیقه بالآیات العتیقه'' ہے ان دونوں رسالوں کا موضوع قرآن پاک کی ان آیتوں کی تفسیر سے ہے۔ جن سے سلوک کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔ اس دوسرے رسالہ کی بنا ایک سابق مؤلف کی تالیف ہے۔ جس کا قلمی رسالہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۳۲۷ھ میں بہاولپور میں ملا تھا اس پر مزید اضافہ کر کے یہ رسالہ مرتب ہوا ہے۔

۴۔علوم الحدیث

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کو حدیث میں جو مہارت حاصل تھی اس کی شہادت ان کے مواعظ و رسائل و تالیفات کے ہزاروں صفحات دے رہے ہیں جن میں بے شمار احادیث کے حوالے، اشارے اور تلخیصات، ان کے مشکلات کی شرح ان کے دقیق مطالب کے حل اور ان کے نکات و لطائف کا بیان ہے۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ کے مواعظ میں جو زبانی تقریریں ہیں، برمحل حدیثوں کے حوالے اور اکثر احادیث کے بعینہ الفاظ مع ان کی تخریجات اور کتابوں کے حوالوں کے اس کثرت سے ان میں ہیں کہ ان کو دیکھ کر کسی انصاف پسند کو ان کے حافظ الحدیث ہونے میں شبہ نہیں ہوسکتا۔

اسکے بعد ان کی تصانیف کو لیجئے جو کو فقہ و فتویٰ اور احکام و مسائل یا اصلاح رسوم اور سلوک میں ہیں۔ لیکن ان کی بنیاد احادیث پر ہے، ان میں احادیث کے حوالے، دلائل

کی مضبوطی اور صحت بیان کی تائید وشہادت کے لئے آئے ہیں، جو مؤلف کے علم ومعرفت پر دلیل قاطع ہیں۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کوفن سلوک کی جوتوفیق عنایت ہوئی تھی، اس کا ایک مبارک اثر یہ ہے کہ حضرت نے احادیث کی کتابوں سے ان تمام حدیثوں کو یکجا فرمایا، جن میں اس فن شریف کے مسائل متفرق تھے، اگرچہ بعض حضرات محدثین نے اپنی کتابوں میں بعض ابواب زہد ورقاق کا تذکرہ کیا ہے، تاہم ان کی حیثیت فن کی نہیں۔ قدماء میں سے صرف ایک بزرگ امام عبداللہ بن مبارک المتوفی ۱۸۱ھ کا نام ہم کو معلوم ہے، جنہوں نے کتاب ''الزھد والرقاق'' کے نام سے مستقل تصنیف فرمائی ہے، مگر یہ ہیچمدان اس کی زیارت سے محروم رہا ہے۔ اس لئے اس کی نسبت کچھ عرض نہیں کرسکتا، مگر قیاس ہے کہ وہ ابن ابی الدنیا کی کتاب کی طرح زہد ورقاق اور مذمت دنیا کے مضامین کی احادیث پر مبنی ہوگی۔

اہلِ سلوک نے جن روایات احادیث سے کام لیا ہے وہ عموماً ضعیف بلکہ موضوع تک ہیں، اسی لئے علمائے سلوک کو اس فن میں کمزور سمجھا گیا ہے اور اسی بنا پر اہلِ حدیث وروایت نے یہ بر خود غلط خیال قائم کرلیا ہے کہ فن سلوک اور اس کے مسائل احادیث نبوی ﷺ سے ثابت نہیں اور صدیوں سے ان کا یہ اعتراض قائم تھا، گو بعض محدثین نے ادھر توجہ فرمائی اور اس سلسلہ میں کچھ کام انجام دیا مثلاً امام ابن ابی جمرہ اندلسی المتوفی ۶۹۹ھ نے صحیح بخاری کی شرح ''بہجۃ النفوس'' کے نام سے لکھی، جس کی پہلی جلد چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اس میں اس کا التزام کیا ہے کہ احادیث کی شرح میں سلوک کے مسائل ونکات کی طرف بھی اشارے کرتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کام کو مستقل طور سے انجام دیا اور ''**حقیقۃ الطریقۃ من السنۃ الانیقہ**'' کے نام سے دو کتابیں تالیف فرمائیں۔

حقیقۃ الطریقہ: ۱۳۲۷ھ میں تالیف پائی ہے اور یہ درحقیقت حضرت کی کتاب

التکشف بمہمات التصوف کا آخری جزو ہے اور ساتھ ہی مستقل تصنیف بھی ہے اس میں تین سو تینتیس احادیث سے جو عموماً صحاح میں مذکور ہیں، سلوک وتصوف کے مسائل کو مستنبط کیا گیا ہے اور ان کو اخلاق، احوال، اشغال، تعلیمات، علامات، فضائل، عادات، رسوم، مسائل، اقوال، توجیہات، اصلاح اور متفرقات کے دس ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ اہلِ علم کے مطالعہ کی خاص چیز ہے۔

التشرف: یہ کتاب چار حصوں میں ہے، ان میں ان احادیث کی تحقیق ہے جو تصوف کی کتابوں میں یا صوفیہ کے کلام میں آتی ہیں۔ اور یہ دکھایا ہے کہ اصول وفن حدیث کی رو سے یہ حدیث کس درجہ کی ہے۔ اور حدیث کی کس کتاب میں ہے اور جو روایات ان میں دراصل حدیث نہ تھیں بلکہ عوام نے غلط فہمی سے ان کو حدیث سمجھ رکھا ہے اگر وہ اقوال نتیجہ کے طور پر کسی دوسری حدیث یا آیت پاک سے ثابت ہیں تو ان احادیث وآیات اور ان سے ان اقوال کی صحت کے طریق واستنباط پر گفتگو فرمائی ہے۔

حصہ اول تشرف میں امام غزالی کی احیاء العلوم کی احادیث کی تخریج ہے، اس حصہ کا ماخذ زیادہ تر امام غزالی کی احیاء العلوم ہے۔ جس کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ احادیث کی دوسری کتابیں ہیں جن کا ماخذ ہر روایت کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ یہ حصہ ۱۳۴۱ھ میں لکھا گیا ہے۔

حصہ دوم میں دفتر اول مثنوی مولانا روم اور اس کی شرح کلید مثنوی میں آئی ہوئی احادیث وروایات کی تخریج کی گئی ہے، اسناد احادیث کی تحقیقات زیادہ تر امام بخاری کی المقاصد الحسنۃ سے التقاط کی گئی ہے یہ حصہ ۱۳۴۹ھ میں زیر قلم آیا۔

حصہ سوم وچہارم ان دونوں حصوں میں حافظ سیوطی کی جامع صغیر سے جو احادیث کی ساری کتابوں کا بہ ترتیب حروف تہجی مجموعہ ہے۔ ان احادیث کو یکجا کیا گیا ہے۔ جن سے مسائل سلوک مستنبط ہیں اور ان کو بہ ترتیب حروف تہجی ترتیب دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی تحقیقات خاصہ کا جا بجا اضافہ اور احادیث کے مطالب کی تشریح وتطبیق اور بعض مشکلات کا حل

کیا گیا ہے، حصہ سوم صرف ''الف'' کی روایتوں پر مشتمل ہے اور ۱۳۵۰ھ میں ترتیب پایا ہے، اور حصہ چہارم میں بقیہ حروف کی روایتیں ہیں اور وہ محرم ۱۳۵۱ھ میں تکمیل کو پہنچا ہے۔

جامع الآثار: حضرات اہلِ حدیث کے اس فرقہ کی طرف سے جو غالی ہے، اکثر حضرات حنفیہ پر طعن کیا گیا ہے کہ حنفی مسائل کی تائید میں احادیث بہت کم ہیں اور چونکہ کتب احادیث زیادہ تر محدثین اور حضرات شوافع کی تالیف ہیں، اس لئے ان میں حنفیہ کی موئد حدیثیں یکجا نہیں ہیں۔ گو امام محمد کی موطا اور آثار اور قاضی ابو یوسف کی کتاب ''الآثار'' اور مسند ابی حنیفہ مرتبہ خوارزمی اور امام طحاوی کی تصانیف سے ان کا جواب دیا جاتا رہا ہے، مگر کتب صحاح و مسانید و مصنفات سے، جو رائج اور محدثین میں مقبول ہیں، چن کر ان احادیث و روایات کو یکجا نہیں کیا گیا تھا جن سے مسائل حنفیہ کی تائید ہوتی تھی۔

یہ ضرورت گو ہمیشہ سے تھی مگر اس زمانہ میں اہلِ حدیث کے ظہور و شیوع سے اس ضرورت کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ چونکہ اس تحریک کا آغاز پورب (عظیم آباد پٹنہ) سے ہوا۔ اس لئے اس ضرورت کا احساس پہلے یہیں کیا گیا۔ چنانچہ حضرت مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید مولانا محمد بن علی ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی نے ''آثار سنن'' کے نام سے کتب حدیث سے التقاط کر کے اس قسم کی حدیثوں کو شائع کیا، اس کے دو ہی حصے شائع ہو سکے، اس کا دوسرا حصہ ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوا، علمائے احناف نے اس کتاب کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس زمانہ میں مدرسہ امینیہ دہلی میں مدرس تھے۔ اس کی مدح میں عربی قصیدے لکھے افسوس ہے کہ مولانا نیموی کی وفات سے ان کا یہ کام ناتمام رہا۔

احیاء السنن: حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس ضرورت کو محسوس فرمایا اور احیاء السنن کے نام سے اس قسم کی احادیث کا مجموعہ مرتب فرمایا اور اس کی ترتیب ابواب فقہیہ پر رکھی لیکن افسوس اس کا مسودہ ضائع ہوا۔

جامع الآثار: کچھ دنوں بعد پھر اس موضوع کا خیال آیا اور دوبارہ ایک جدید

اسلوب پر اس قسم کی حدیثوں کا مجموعہ جامع الآثار کے نام سے مرتب فرمایا لیکن یہ سلسلہ ''ابواب الصلوٰۃ'' سے آگے نہیں بڑھا' تاہم جتنا مرتب ہوگیا وہ چھپ کر شائع ہوگیا۔

تابع الآثار: یہ بھی اسی موضوع پر ہے، اور اس کو جامع الآثار کا ضمیمہ بنایا گیا ہے۔

''احیاء السنن'' کا احیاء: ۱۳۳۱ھ میں یہ خیال ہوا کہ یہ کام اتنا بڑا ہے کہ حضرت والا خود اس کام کو تنہا انجام نہیں دے سکتے۔ اس لئے یہ قرار پایا کہ اس کے لئے بعض مستند علماء کو رکھ کر کام لیا جائے۔ چنانچہ مولانا محمد احسن صاحب سنبھلی کو اس کام کے لئے مقرر کیا گیا، انہوں نے کام شروع کیا، جو کام وہ کرتے جاتے مولانا کی نگاہ سے گذارتے جاتے تھے۔ اس طور سے کتاب الحج تک کام ہوا۔ اور اس کا نام دوبارہ ''احیاء السنن'' رکھا گیا۔ تاکہ مرحوم ''احیاء السنن'' کی یادگار ہو، اس کے دو حصے شائع ہوئے تھے کہ بعض اسلوب سے اس کتاب کے بعض مضامین سے مولانا کی تشفی نہیں ہوئی اور اس پر استدراک لکھوانے کا خیال ہوا۔ اور آئندہ کام کے لئے مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کا انتخاب ہوا۔

الاستدراک الحسن: مولانا ظفر احمد صاحب نے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے زیر ہدایت اس کام کو بڑی دیدہ ریزی، وسعت نظر اور تحقیق و تنقید کے ساتھ انجام دینا شروع کیا سب سے پہلے احیاء السنن کے شائع شدہ حصہ پر دوبارہ نظر کر کے اس کو ''الاستدراک الحسن'' کے نام سے شائع کیا گیا۔

اعلاء السنن: اس کے بعد احیاء السنن کے نام کو بدل کر ''اعلاء السنن'' کے نام سے اس کام کو شروع کیا گیا اور اس وقت تک اس کی بارہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں مذہب حنفی کی مؤید حدیثوں کو بڑے استیعاب کے ساتھ جمع کیا گیا اور محدثین اور اہل فن کی تحقیقات، اور اس کے شروح و حواشی میں یکجا کئے گئے ہیں، امید ہے کہ مولانا ظفر احمد صاحب ابھی اس سلسلہ کو جاری رکھ کر بانی اول کے حق میں صدقۂ جاریہ کا باعث بنیں گے۔

الخطب الماثورہ من الآثار المشہورہ: جمعہ و عیدین کے خطبوں میں اس درجہ تکلف و تصنع اور مضامین کے ابتذال سے کام لیا گیا ہے کہ یہ بازاری خطبے زبان اور

طرز ادا اور مضامین ومطالب کے لحاظ سے عہد نبوت اور خلافت راشدہ کے اسلوب سے ہٹ کر بلغاء اور خطباء کے اظہار قابلیت کا دنگل بن کر رہ گئے ہیں۔ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی اصلاحی نظر سے محراب وممبر کا یہ گوشہ بھی مخفی نہیں رہا۔ چنانچہ "الخطب الماثورہ من الآثار المشہورہ" کے نام سے آنحضرت ﷺ اور حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے خطبات کو احادیث صحیحہ سے انتخاب فرما کر ایک جگہ جمع کر دیا۔ تاکہ خطبائے مساجد ان مسنون خطبوں کو پڑھ کر ان تکلفات باردہ کے گناہوں سے محفوظ رہیں۔

خطبات الاحکام: جمعہ اور عیدین کے پچاس خطبوں کا یہ مجموعہ تالیف فرمایا، جس میں احادیث وآثار وآیات سے ترغیب وترہیب کے مضامین کے علاوہ عقائد واعمال و اخلاق کے مضامین درج فرمائے۔

مناجات مقبول: احادیث میں وارد، اوراد واذکار مسنونہ کے لئے حصن حصین و حزب اعظم ملا علی قاری وغیرہ کتابیں رواج پذیر ہیں۔ مگر وہ طویل ہونے کی وجہ سے سب کے کام کی نہیں، حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے عام مسلمانوں کے فائدے کے لئے ان سب سے تلخیص کر کے "مناجات مقبول قربات عنداللہ وصلوٰت الرسول" کے نام سے ایک مختصر مجموعہ تالیف فرمایا، جو اپنے اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے بے حد مقبول ہے۔

۵۔ علوم الفقہ

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کو مسائل فقہیہ کی تلاش وتحقیق کا خاص ذوق تھا، اور یہ ذوق ان کو اپنے شیوخ واساتذہ کرام سے ورثہ میں ملا تھا۔ چنانچہ ابھی تعلیم سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فتویٰ نویسی کی خدمت لینی شروع کر دی تھی اگر حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی خدمات کا آغاز ۱۳۰۱ھ سے بھی کیا جائے تو ۱۳۶۲ھ تک بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ پورے ساٹھ سال اس فن شریف کی خدمت میں بسر کئے اس طویل عرصہ میں ہزاروں

مسئلوں کے جواب دیئے۔ ہزاروں فتوے اور سینکڑوں چھوٹے بڑے فقہی رسالے لکھے متعدد ضخیم جلدوں میں امداد الفتویٰ اور تتمہ امداد الفتویٰ کے نام سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی فتاوے کے مجموعے جمع کئے گئے ہیں۔ جس کی نظیر ہندوستان میں کم از کم نہیں ملتی۔ وذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

حوادث الفتاویٰ: کے نام سے ان فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو اس زمانے کے نئے مسائل اور نئے مصنوعات سے متعلق ہیں، جن کے جوابات گزشتہ کتب فتویٰ سے بہ آسانی حاصل نہیں کئے جا سکتے۔

بہشتی زیور: کی دس جلدیں جو کو عورتوں کی ضروریات کے لئے ہیں مگر ان میں تمام ابواب فقیہ کے مسائل مندرج ہیں، جن کے جوابات ہندوستان کے حالات اور ضروریات اور اصطلاحات کے مطابق صرف انہی کتابوں سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

ترجیح الراجح: یہ وہ مجموعہ ہے جس کی نظیر سلف صالحین میں تو ملے گی مگر متاخرین کے یہاں یہ سلسلہ بالکل مسدود ہے۔ اس مجموعہ میں حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ان مسائل کو جمع فرما دیا ہے۔ جن میں از خود یا کسی دوسرے کے توجہ دلانے سے کوئی تسامح نظر آیا تو اس سے رجوع فرما کر مسئلہ کی مزید تحقیق فرما کر تصحیح کر دی۔ یہ سلسلہ حضرت کی انصاف پسندی، تواضع اور عدم نفسانیت کا بین ثبوت ہے، یہی حضرات صحابہ کرام ﷺ حضرات تابعین و تبع تابعین اور مجتہدین عظام کا طریق تھا، جس کو اس زمانہ میں حضرت حکیم الامت نے زندہ کیا اور اپنے کو بارِ آخرت سے بچایا۔

فتاویٰ اشرفیہ: کے نام سے مسائل دینیہ کے تین حصے الگ شائع ہوئے جو مختصر رسائل ہیں۔

بہشتی گوہر: بہشتی زیور کے سلسلہ کا مردانہ حصہ ہے جس میں خاص طور سے ان مسائل کا بیان ہے جو مردوں سے خاص ہیں، جیسے جمعہ، جماعت، عیدین وغیرہ

انکے علاوہ مسئلہ حجاب، مسئلہ ربا، مسئلہ رشوت، مسئلہ بنک، سینما اور فلم اور ریڈیو وغیرہ

کے مسائل پر فقہی تحقیقات ہیں اور بعض موضوعوں پر بار بار کئی رسالے تالیف فرمائے۔

۶۔ علم کلام

علم کلام وعقائد و توحید پر متعدد رسالے قلم بند فرمائے جو شائع و ذائع ہیں، خاص نئے زمانہ کے حالات کا خیال کر کے خود چند کتابیں تالیف فرمائیں اور دوسروں سے ترجمہ کرائیں۔ مثلاً:

"اسلام اور سائنس" کے نام سے "الحصون الحمیده" کا مولانا اسحٰق صاحب سے ترجمہ کرایا، یہ عربی کی ایک جدید کلامی تصنیف ہے اس کے مصنف علامہ جسری ہیں۔ جنہوں نے سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں اس کو ملک شام میں تصنیف فرمایا تھا، اور جو نئے حلقوں میں بہت پسند کیا گیا تھا، اس کی خاص صفت یہ ہے کہ اس میں تاویل فاسد کا دروازہ نہیں کھولا گیا۔

"المصالح العقلیه للاحکام النقلیه" تین حصوں میں ترتیب پایا ہے۔ جس میں اسلامی احکام و مسائل کے مصالح و حکم بیان کئے گئے ہیں۔ پہلے حصہ میں نماز و زکوٰۃ، دوسرے میں روزہ، عیدین، صدقۂ فطر، قربانی، حج، نکاح و طلاق وغلامی وغیرہ کے مسائل کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ تیسرے حصہ میں خرید و فروخت و معاملات۔ حدود و قصاص، فرائض۔ عذابِ قبر اور معاد کے متعلق اسلامی تعلیمات کے مصالح ہیں۔

"الانتباهات المفیده عن الاشتبهات الجدیده"۔ یہ بھی علم کلام ہی کا باب ہے۔ اس میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے مذہبی خدشوں اور وسوسوں کے تشفی بخش جوابات درج ہیں۔

"اشرف الجواب" یہ بھی اسی قسم کا ایک مجموعہ ہے، جو مواعظ و ملفوظات سے جمع کیا گیا ہے جس میں بہت سے نئے اور پرانے شبہات و خطرات کے جوابات فراہم کئے گئے ہیں۔

۷۔علم سلوک وتصوف

علم سلوک وتصوف روح شریعت کا نام ہے۔جس میں اخلاصِ دین اوراعمال قلب کے احکام اوردقایق سے بحث کی جاتی ہے۔قدماءصوفیا نے اس پر جو کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاًرسالہ قشیریہ۔''امام قشیری،قوت القلوب ابوطالب مکی''کتاب للمع ،ابونصرعبداللہ بن علی سراج الطّوسی، کتاب الصدق، ابوسعید خزار،فتوح الغیب، شیخ سہروردی اور غنیۃ الطالبین۔شیخ عبدالقادر جیلانی اورمتاخرین میں تصانیف امام شعرانی،ان کو پڑھنے سے اس فن کی جوحقیقت ظاہرہوتی ہے،افسوس ہے کہ مصنوعی اوردوکاندارصوفیہ اورمبتدعہ کی تلبیس نے اس پرایساپردہ ڈالدیاتھاکہ وہ کبھی توبدعات کا مجموعہ بلکہ بطلان وضلالت کا ذخیرہ معلوم ہوتاہے پھرہندوستان میں ہندوؤں کے جوگ اورویدانت کے اثرسے اس میں بہت سے ایسے مسائل شامل ہوگئے جواسلام کی روح کے تمام ترمنافی ہیں۔حتی کہ وحدت وجود، وحدت شہود ولطائف ودوائر کے مباحث واعمال بھی اصل فن سے قطعاً الگ ہیں، جو یاتوعلم کلام وفلسفہ یااوہام وخیالات واحوال سے وابستہ ہیں جن کاتعلق نفسیات سے ہے۔

اصل شئے جواخلاص فی الدین۔طلب رضا،حصول قرب اوراعمال واخلاقِ قلب و مقامات ہیں اورجن سے مقصودرذائل سے پاکیزگی اورفضائل سے آراستگی ہے،تمام تر متروک ہوگیاتھا،صدیوں کے بعدحضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی تجدیدی مساعی نے اس فن کوپھرسلف صالحین کے رنگ میں پیش کیااورہرقسم کے اضافوں اورآمیزشوں سے پاک کرکے کتاب وسنت کے نورمیں اس تاریک زمانہ کے اندرپھرظاہرکیا،اورزبان وقلم سے ان مسائل پراتنا کچھ لکھااوربیان فرمایا کہ اب طالب پراصل طریق کا کوئی گوشہ اندھیرے میں نہیں رہا۔وللہ الحمد!

اس سلسلہ میں پہلی چیزقصدالسبیل ہے جو پچاس ساٹھ صفحوں کامختصررسالہ ہے،لیکن اس کوزہ میں دریابند ہے۔فن سلوک کے وہ تمام حقایق وتعلیمات جوسالہا سال سے

معلوم ہو سکے اور جن کے نہ جاننے سے سالکین و طالبین غلط راستوں پر پڑ کر منزل مقصود کو گم کر دیتے ہیں۔ اس میں لکھ دیئے گئے ہیں، اگر کوئی طالب صادق صرف اسی ایک رسالہ کی تعمیل و تکمیل میں عمر صرف کر دے تو اس کے لئے انشاء اللہ کافی ووافی ہے۔

جاہل پیروں اور دوکاندار صوفیوں نے ایک مسئلہ یہ گھڑا ہے کہ شریعت اور طریقت دو چیزیں ہیں اور اس زور شور سے اس کو شہرت دی ہے کہ عوام تو عوام خواص تک پر اس کا رنگ چھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ تمام تر لغو اور بے معنی ہے۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے تمام عمر لوگوں کو یہی تلقین فرمائی کہ طریقت عین شریعت ہے، احکامِ الٰہی کی بہ اخلاص تمام تعمیل و تکمیل ہی کا نام طریقت ہے۔ دگر ہیچ۔ اور یہی خواص امت کا مذہب ہے اور جس نے اس کے سوا کہا وہ دین کی حقیقت سے جاہل اور فن سلوک سے نا آشنا ہے، اس بارگاہ کے ایک حلقہ بگوش کا شعر ہے۔

اب تو مئے نوشی ہے عین شرع بر فتوائے شیخ!
اب وہی ہوگا فقیہ شہر جو مئے نوش ہے [1]

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس فن کے مسائل کو سب سے پہلے کلام پاک سے مستنبط فرمایا اور اس کے متعلق "**مسائل السلوک من کلام ملک الملوک**" اور "**تائید الحقیقة بالآیات العنیقه**" نام دو رسالے تالیف فرمائے ہیں۔ جن کا ذکر اوپر گذر چکا، پھر ان مسائل سلوک کی تشریح فرمائی جن کا ماخذ احادیث نبوی ﷺ اور سنتِ صحیحہ ہے اور یہ "**التشرف**" اور "**حقیقة الطریقة من السنة الانیقه**" میں مدون ہیں۔

اہل تحقیق کے لئے اس فن شریف پر ایک جامع کتاب "**التکشف بمهمات التصوف**" تالیف فرمائی جو پانچ حصوں میں منقسم ہے، یہ حقیقت طریقت، حقوق طریقت، تحقیق کرامت اور دیگر مضامین تصوف پر مشتمل ہے۔

طریق اور سلوک کے اسرار اور رموز اس قدر دقیق اور نازک ہیں کہ ذرا ان کے سمجھنے

---

[1] یہ شعر خود صاحبِ مقالہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کا ہے (مؤلف)

میں بے احتیاطی کی جائے تو ہدایت کے بجائے وہ ضلالت کا ذریعہ بن جائیں، اس سلسلہ میں حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی جو مثنوی معنوی کے نام سے سر دونواز حقیقت ہے، اور اسی لئے وہ اس سلسلہ کے اکابر کے خانقاہی درس میں رہی ہے۔ حضرت حاجی امداداللہ رحمۃ اللہ علیہ کو اس سے خاص ذوق تھا، اور وہ یہی خاص خاص لوگوں کو درس دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب کے ایماء سے مولانا احمد حسن صاحب کانپوری نے بڑے اہتمام سے اس کا حاشیہ لکھا اور منشی رحمت اللہ مرحوم کے مطبع نے اس کو چھاپا، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا بحرالعلوم کے بعد مثنوی کی حکیمانہ شرح اس سے بہتر نہیں لکھی گئی۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں حضرت حکیم الامت نے اس مثنوی کی خدمت محض فن کی حیثیت سے فرمائی، سلوک کے مسائل طریقت کی تعلیمات اور مثنوی کے بیانات کی قرآن وحدیث سے اس خوبی کے ساتھ کلید مثنوی میں تطبیق فرمائی کہ اب فن کا مبتدی بھی چاہے تو اس کلید کے ذریعہ سے مثنوی کے خزانہ کو کھول سکتا ہے۔

دیوان حافظ کی پر جوش و مردافگن شراب نے بھی بہت سے بے احتیاط مئے نوشوں کو راہ سے بے راہ کر دیا تھا، بدگمانوں کو تو اس شراب معرفت پر شیراز کے بادۂ انگور کا شبہ ہوا، اور بے احتیاط خوش گمانوں نے اس سے اباحت کی تعلیم حاصل کی کہ۔

به مئے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود نوراہ و رسم منزلہا

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی معرفت اس تیز وتند شراب کے "منافع واثم" سے پوری طرح باخبر تھی، حضرت نے "عرفانِ حافظ" کے نام سے اس کی ایسی شرح لکھی کہ اس پھول سے ہر کانٹا الگ ہوگیا۔ ع

ساقی پلائے پھول تو کانٹا نکال کے

طالبین وسالکین کی تعلیم وتربیت کے لئے "تربیۃ السالک وتنجیۃ الهالک" کا سلسلہ الگ مرتب فرمایا۔ جس میں سالکین کے مشکلات راہ، ذاکرین وشاکرین وشاغلین کے

شبہات وخطرات راہ کے لئے ہدایات مندرج ہیں، یہ کہنا بے جا نہیں کہ علوم مکاشفہ و معاملہ کے متعلق کلیات و جزئیات اور احوال شخصی پر ایسی حاوی کتاب کی نظیر تصوف کے سارے دفتر میں موجود نہیں، بارہ سو بہتر صفحوں میں یہ کتاب تمام ہوئی ہے۔

ایک دوسرا اہم سلسلہ ''ملفوظات'' کا ہے، بزرگوں کے ملفوظات مرتب کرنے کی رسم قدیم زمانے سے قائم ہے، یہاں تک کہ چشتیہ حضرات میں حضرت سلطان خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات بھی موجود ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اہلِ شوق اس کام کو پورے استیعاب سے نہ کر سکے، کیونکہ ان اکابر کے جو ملفوظات قلم بند ہو سکے وہ چند سال بلکہ چند ماہ سے زیادہ کے نہیں ہیں۔ اور نہ ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنے والوں نے ان کو ان بزرگوں کی نظرِ کیمیا اثر سے گذارا بھی تھا، تاہم چونکہ لکھنے والے خود اہلِ کمال و اہلِ احتیاط تھے، اس لئے ان کی صحت میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا اور وہ اس اختصار پر بھی ہمارے لئے بڑی خیر و برکت کی چیزیں ہیں۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کا سلسلہ تقریباً ساٹھ مجلدات اور رسائل میں مدون ہوا ہے اور ان میں سے ہر ایک ان کی نظر سے گذر ان کر چھاپا گیا ہے۔ اور جن میں سے اکثر ''حسن العزیز'' وغیرہ ناموں سے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ ان ملفوظات میں بزرگوں کے قصے، سنجیدہ لطیفے، قرآن و حدیث کی تشریحات، مسائل فقیہہ کے بیانات، سلوک کے نکتے، اکابر کے حالات طالبوں کی ہدایات و تنبیہات، آداب واخلاق کے نکات، اصلاحِ نفس و تزکیہ کے مجربات وغیرہ اس خوبی و دلچسپی سے درج ہیں کہ اہلِ شوق کے دل اور دماغ دونوں اس آب زلال سے سیراب ہوتے ہیں۔

۸۔ اصلاحیات

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے معارف کا یہ آخری باب ہے اور خاصہ اہم باب ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح کی جو دقیق نظر ان کو بارگاہِ الٰہی سے عنایت ہوئی تھی، اس کا

اندازہ ان کی اصلاحی کتابوں سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ اصلاح کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بچوں، طالب علموں، عورتوں سے لے کر مردوں، علماء وفضلاء کے حلقہ تک پھیلا ہوا ہے اور سب کیلئے مفید ہدایات کا ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔

دوسری طرف ان اصلاحات کی وسعت یہ ہے کہ مجالس و مدارس اور خانقاہوں سے شروع ہوکر شادی وغمی کے رسوم اور روزمرہ کی زندگی تک کو وہ محیط ہیں، غرض ایک مسلم جدھر اپنی زندگی میں رخ کرے، ان کے قلم نے شریعت کی ہدایت کا پروگرام تیار کر رکھا ہے!

اس سلسلہ میں حضرت کی سب سے اہم چیز ''مواعظ'' ہیں ۔۔۔تو بحمداللہ زمانہ خیر کے بعد اسلام کی دس بارہ صدیوں میں بے شمار گذرے ہوں گے مگر شاید واعظین میں ''ابن نباتہ'' اور ائمہ سلوک میں حضرت شیخ الشیوخ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کے سوا کوئی دوسرا مستند اور مفید مجموعہ موجود نہیں۔ لیکن یہ ان بزرگوں کے صرف چند مواعظ پر مشتمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آخیر دور میں امت اسلامیہ کی اصلاح کے لئے بہت بڑا فضل یہ فرمایا کہ حضرت کے مستفدین کے دل میں یہ ڈالا کہ وہ حضرت کے مواعظ کو جو شہر بہ شہر ہوئے ہیں عین وعظ کے وقت لفظ لفظ قید تحریر میں لائیں اور حضرت کی نظر سے گذران کران کو دوسرے مسلمانوں کے عام فائدے کی غرض سے شائع کریں، چنانچہ اس اہتمام اور احتیاط کے ساتھ تقریباً چار سو مواعظ جو احکام اسلامی رد بدعات، نصائح دل پذیر اور مسلمانوں کے مفید تدابیر و تجاویز پر مشتمل ہیں اور جن میں حقائق کے ساتھ ساتھ دلچسپیوں کی بھی کمی نہیں، مرتب ہوئے ہیں اور اکثر شائع ہوئے اور مسلمانوں نے ان سے فائدے اٹھائے۔

سلسلۂ اصلاح وترتیب میں حضرت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عموماً واعظین صرف عقائد وعبادات پر گفتگو فرماتے ہیں، حضرت ان چیزوں کی اہمیت کے ساتھ مسلمانوں کے اخلاق ومعاملات اور عملی زندگی کے کاروبار کی اصطلاح پر زور دیتے ہیں، بلکہ اپنی تربیت وسلوک کی تعلیم میں بھی ان پر برابر کی نظر رکھتے تھے حالانکہ عام مشائخ نے

اس اہم سبق کو صدیوں سے بھلا دیا تھا۔

مواعظ کے علاوہ اس سلسلہ کی اہم کڑی ان کی کتاب ''حیوٰۃ المسلمین'' ہے جس میں قرآنِ پاک واحادیث نبویہ ﷺ کی روشنی میں مسلمانوں کی دینی و دنیاوی ترقی وفلاح کا مکمل پروگرام مرتب فرمایا ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بارہا ارشاد فرمایا کہ انہوں نے اپنی ساری تصنیفات میں اس کتاب کی تالیف میں جو محنت اٹھائی ہے وہ کسی میں نہیں پیش آئی اور اسی لئے یہ بھی ارشاد ہے کہ ''میں اپنی ساری کتابوں میں اس کتاب کو اپنے لئے ذریعہ نجات گمان کرتا ہوں۔''

اس سلسلہ کی دوسری کتابیں اصلاح الرسوم، صفائی معاملات اصلاح امت، اصلاح انقلاب امت وغیرہ میں اور ہر ایک کا منشاء یہ ہے کہ مسلمانوں کی اخلاقی، اجتماعی، معاشرتی زندگی خالص اسلامی طریق اور شرعی نہج پر ہو اور ان کے سامنے وہ صراط مستقیم کھل جائے، جو ہدایت کی منزل مقصود کی طرف جاتی ہے۔

افسوس کہ اس مضمون کو جس استیعاب اور اہتمام کے ساتھ یہ ہیچمدان لکھنا چاہتا تھا اپنی علالت وعدم صحت کے سبب اس طرح پورا نہ کرسکا تاہم جو کچھ ہوا وہ اگر مسلمانوں کے لئے فائدہ بخش ثابت ہو تو بہت ہے۔

طوفان اشک لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

باب سوم
نقوش عملیہ

خانقاہ کی حقیقت واہمیت

بعض حقیقتیں محض الفاظ کی قدامت کے باعث مانی نہیں جاتیں اور اس کی وجہ محض جدت کا ناز ہے، ورنہ جو نگاہ حقایق تک پہنچ جائے وہ اعتراف پر مجبور ہوگی۔

''خانقاہ'' کے لفظ کے ساتھ عجمیت و رہبانیت اور خدا جانے کس کس قسم کے غلط تصورات عام طور پر ذہن میں آجاتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ ''خانقاہ'' ایک ایسے معمل کا نام ہے جہاں علوم باطنی کی عملی تعلیم و تربیت ہوتی ہے یا یوں کہئے کہ یہ ایک ایسا ماحول ہے جو غیر اسلامی زہریلے اثرات سے پاک اور روح کے لئے صحت بخش ہوتا ہے۔ اب بتایئے کہ دنیا کا ایسا کون سا تعلیمی نظام ہے جو بلا تربیتی نظام کے کامیاب ہوسکا ہے اور کونسی تعلیم گاہیں، یونیورسٹیاں اور کالج ہیں جن کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس اور ہاسٹلوں کا قیام ضروری نہیں ہے؟ اور کس ماہر تعلیم کے نزدیک درسگاہ اور اس کے اقامت خانہ کا ایک ساتھ اور ایک علیحدہ ماحول میں قیام ضروری ولازمی نہیں ہے؟ مشہور انگریزی ادیب و ماہر تعلیم نیومن (Newman) کے مضامین پڑھ جایئے تو پتہ چلے گا کہ اس نے اس کی اہمیت کو کس زور سے منوایا ہے! اور یہ بات اس وجہ سے ناگزیر ہے کہ محض کتاب وتقریر سے ذہنیت وعمل کو بدلا نہیں جاسکتا بلکہ اس کے لئے ایک خاص ماحول کا پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور اس ماحول کا اثر اتنا گہرا اور قوی ہوتا ہے کہ گو مختلف صلاحیتوں اور استعدادوں کے لوگ یہاں آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق علوم کی تحصیل میں لگے رہتے ہیں لیکن دو چار برس یہاں رہ کر ان کے اندر بطور قدر مشترک، ایک خاص طرز فکر ایک مشترک زاویہ نگاہ اور مشترک طرز زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے آپس میں ہمرنگ اور دوسروں سے ممیّز وممتاز ہو جاتے ہیں۔ یہی منشاء ہے ہاسٹلوں کے قیام کا!

آج بڑے بڑے ماہرین نفسیات کو ماحول کے ان قوی اثرات کا اعتراف ہے۔
چنانچہ ان ہی میں کے ایک جے، ڈبلو واٹسن کا دعویٰ ہے:

''بارہ ۱۲ صحت مند توانا بچے میرے حوالہ کرو اور مجھ کو اپنے خاص ماحول میں ان کی تربیت کا موقع دو تو میں ان میں سے بلا تخصیص جس کو جس چیز کا ماہر بنانا چاہوں گا بنالوں گا۔ ڈاکٹر، مقنن، آرٹسٹ اور ہاں چاہوں تو بھکاری اور چور بھی۔ خواہ ان کی استعدادیں ان کے رجحانات، ان کی صلاحیتیں اور ان کی نسلی و آبائی پیشے کچھ ہی ہوں۔'' [1]

خیر یہ تو انتہا پسندی کی بات ہوئی اور خود دوسرے ماہرین نفسیات نے بھی اس کو غلو سے تعبیر کیا ہے، مگر ایس، ایس سارجنٹ کا یہ بیان تو میزانِ عدل میں صحیح ہے اور کسی کو اس سے اختلاف نہیں ہوسکتا کہ:

''یہ پوچھنا کہ ''ورثہ'' (یعنی موروثی خصوصیات) اصل شے ہے یا ''ماحول''؟ یہ ایسا ہی سوال ہے جیسے کوئی یوں پوچھے کہ موٹر کار دوڑانے کے لئے کونسی چیز اہم ہے موٹر انجن یا پیٹرول؟ ظاہر ہے کہ دونوں ہی ضروری ہیں۔ ''ورثہ'' میں تو وہ مواد خام ملتا ہے جس سے انسان کی تشکیل ہوتی ہے لیکن جو کچھ بنتا ہے اور جس انداز میں اس کا مواد خام ڈھلتا ہے' اس کا بڑا انحصار ماحول پر ہے۔ اچھا مواد اچھے ہاتھوں (یا ماحول) میں پہنچ کر ایک ''اعلیٰ'' صورت اختیار کرتا ہے اور بُرا مواد خواہ کتنی ہی اچھی اس کی پرداخت ہو وہ کبھی ''درجہ اوّل'' کا ثابت نہیں ہوسکتا۔''

یعنی کچھ تو ضرور ہی بنتا ہے۔ بقول مجذوبؔ ع

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے!

انسانی ماحول کا اثر محض ''ذوات انسانی'' تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ ساری فضا اس گروہ انسانی کے نیک یا بد اعمال سے ''متاثر'' ہوتی ہے جس میں وہ رہتے بستے ہیں اور

---

[1] "The Basic Teaching of the Great Psychologists" , G.S. Sargent صفحات ۶۱، ۷۹، ۸۰

بعد میں خود یہ فضا ایک ''موثر'' بن جاتی ہے!! اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک ایسی جگہ جو مدتوں مقتل رہی ہو کسی ایسے شخص کو لے جایئے، جو اس جگہ کی خصوصیت سے بالکل لاعلم ہو، دیکھئے کہ اس کا دل خوامخواہ دھڑ کنے لگے گا۔ پھر اسی شخص کو ایک ایسی فضا میں لے آئے جہاں کبھی اللہ والوں نے پیہم ''اللہ اللہ'' اور لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی رٹ لگائی ہو آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنی عدم واقفیت کی بنا پر وجہ تو نہ بتا سکے گا لیکن اس کو یہاں پہنچ کر سکون میسر آئے گا اور اندر ہی اندر اس کے قلب میں سرور کی ایک لہر دوڑ جائے گی۔ یہ کیوں؟ اس وجہ سے کہ فضا خود ایک ''موثر'' بن گئی ہے!!

غرض انسانی ماحول اور فضا وہ موثرات ہیں جن سے انسانی دل اور دماغ ہر آن متاثر ہوتا رہتا ہے اور ان اثرات کے ماتحت اس کا عمل ایک خاص سانچہ میں ڈھلتا رہتا ہے۔ پس اب جبکہ دنیا کی وسعتیں اکثر و بیشتر غیر اسلامی ماحول سے پٹی پڑی ہیں تو مسلمانوں کی دینی تربیت کے لئے خاص، تربیت گاہوں کا قیام اور ایک خاص فضا کی فراہمی کس درجہ ضروری اور ناگزیر ہوگئی ہے قیام خانقاہ کا مقصد صرف یہی ہے اور خانقاہ کی حقیقت اس کے سوا کچھ اور نہیں؟

یہ گفتگو تو عقل پرستوں کو مخاطب کر کے کی گئی۔ لیکن آج ایک ایسا گروہ بھی ہے جو خود کو تعلیمات اسلامی کا حامی اور ''تحریک اسلامی'' کا علمبردار سمجھتا ہے لیکن اس کی نگاہ چونکہ ان نفسیاتی مسلمات و حقایق تک نہیں پہنچتی اس لئے وہ ''خانقاہ'' کے لفظ ہی سے اس پر عجمیت کا فتویٰ صادر کرتا ہے اور وہ اس کے بغیر ہی دینی ''اخلاق'' پیدا کرنے کا مدعی ہے! حالانکہ گویا یہ بات ایسی ہی ہے جیسے کوئی طبیب اپنے نقصِ علم وفن کی بناء پر یہ دعویٰ کرے کہ دق کے مریضوں کے لئے سینیٹوریم قائم کرنا اور ان کو وہاں رکھنا سب فضول ہے۔ ان کا علاج تو اسی دق سے متاثرہ ماحول میں ہونا چاہئے۔

حضور اکرم ﷺ کے عہد زریں میں بلکہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں بھی چونکہ مسلمان علم وعمل کے فرق سے ناآشنا تھے اور دین کی اصل اور اس کی روح سے پوری

طرح باخبر تھے اس لئے یہاں کسی الگ دینی تربیت گاہ کا وجود تھا نہ اس کی ضرورت! مگر دیکھئے کہ صحابہ اور تابعین'' کی عظمت و مرتبت خود اپنے لقب سے اس بات کا کھلا ثبوت ہی ہے کہ حضور انور ﷺ کی تعلیم میں ''صحبت'' اور ''ماحول'' کو کیا درجہ و مقام حاصل ہے، اور اس کا سیرت سازی میں کتنا عظیم الشان حصہ ہے۔ اور اس کی وجہ سے ایک مسلمان آناً فاناً کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے!! ویسے خود عہد نبوی ﷺ میں اصحاب صُفّہ کا وجود اور ان کی تعلیم و تربیت کا نظام ایک خانقاہ کا آئیڈیل ہی تو ہے!

جب جامعیت کے یہ دور ختم ہو چکے اور سیاست اور حکومت کی زمام ایک ایسے طبقہ کے ہاتھ میں آئی جس کی نظر میں دین کا اصل کام یعنی تزکیہ اور تعلیم کتاب وحکمت ثانوی حیثیت حاصل کر گیا اور ملک گیری اور تزک و احتشام ان کی غایت قرار پائے تو بعض نفوس قدسیہ نے موقع کی نزاکت کو تاڑا، وہ لرز گئے کہ کہیں بعثت نبوی ﷺ کا منشائے حقیقی ہی فوت نہ ہو جائے، اسی جذبہ کے ماتحت انہوں نے دین کی اصل کو سنبھالنا اپنا فریضۂ واحد قرار دیا، سیاست سے کنارہ کش ہو کر ایسی دینی تربیت گاہیں قایم کیں جہاں سے دینِ حنیف کو سمجھنے والے اور سنت مطہرہ سے عشق و وارفتگی رکھنے والے پیدا ہونے لگے، یہی تربیت گاہیں بعد کو ''خانقاہ'' کہلائیں۔ اور اسی ماحول کے پروردہ ''صوفیائے کرام'' کہلائے۔ ان صوفیائے عالی مقام نے اپنے ان اداروں کے متواتر قیام کے ذریعہ تبلیغ و اشاعتِ دین کے وہ کارنامے انجام دیئے جن سے آج تاریخ اسلام کی زینت ہے!

اس سے ہم کو انکار نہیں کہ آج بہت سی ''خانقاہوں'' سے ان کی حقیقی غرض و غایت مٹ چکی ہے، لیکن کیا اس کی وجہ سے اس ادارہ کی افادیت وضرورت ہی کا انکار لازم آئے گا اور اس کی بیخ کنی کی جائے گی؟ یہ تو کوئی طریقہ اصلاح نہیں کہ اپنے جن جن اچھے طریقوں اور اصلاح کے اصولوں میں جہلا اور نفس پرستوں کے دخل کی وجہ سے خامیاں اور خرابیاں آگئی ہوں، سرے سے ان طریقوں اور اصولوں ہی کو ختم کر دیا جائے؟ اگر یہی اصولِ اصلاح ٹھہرے کہ جس شئے میں خرابی آجائے اس شے ہی کو فنا

کردیا جائے، تو پھر ہم کو اپنے مدارس اور مساجد کے دروازے بھی بند کردینے چاہئیں جن میں بے شمار خرابیاں راہ پا گئی ہیں! یہ طریقہ تعمیر کا نہیں تخریب کا ہے، یہ اصلاح نہیں تباہی ہے!

ہر صدی کے سرے پر ''مجددین'' کے آمد کی نبوی پیش گوئی اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اصل سے آمیزش کو دور کرنا اور اصل کو اپنے رنگ میں برقرار رکھنا یہی ''اصلاح'' ہے!

خانقاہ امدادیہ

جیسا کہ عرض کیا جاچکا، خانقاہوں کا قیام گو اس نام سے نہ ہو مگر ایک تربیتی نظام کی شکل میں ابتدائی عہد ہی میں موجود تھا اور پھر رفتہ رفتہ اکناف عالم میں پھیلا اور آج تک چلا آرہا ہے لیکن مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ اکثر خانقاہوں سے ان کے قیام کی اصلی غرض وغایت اٹھتی گئی اور یہ جو گیانہ رسوم ورواج کا آماجگاہ بن گئیں۔ پھر بھی یہ ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ ہر دور میں چند خانقاہیں ضرور ایسی ہیں جہاں تربیت اخلاق کا عظیم الشان فرض ہمیشہ انجام پاتا رہا ہے۔ اور یہاں آکر بڑے بڑے اہل علم نے اپنے غرور علمی کو بڑے بڑے امراء نے اپنی نخوتِ دولت و جاہ کو اور کٹر دنیا داروں نے اپنی حب دنیا کو دور کیا ہے، اور اس روح پرور ماحول میں رہ کر صبر وشکر، ایثار و تواضع توکل و قناعت اور اخلاص و ہمت کے اعلیٰ انسانی صفات اپنے اندر پیدا کئے ہیں۔ چنانچہ کون کہہ سکتا ہے کہ گذشتہ نصف صدی تک گنج مراد آباد میں شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے بھوپال میں شاہ ابو احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فیض سے اور تھانہ بھون، دیوبند اور سہارنپور میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ و مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قیام سے اور حیدر آباد دکن میں شاہ سعد اللہ صاحب مجددی کے وجود سے (رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) یہی دینی ماحول پیدا نہ تھا، اور حقیقی خانقاہیت موجود نہ تھی؟ اس سلسلہ کی دور حاضر کی آخری کڑی ''خانقاہ امدادیہ'' تھانہ بھون تھی، جہاں حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہ کے ذریعہ تعلیم اخلاق و تزکیہ نفوس کا ایک عظیم الشان اور وسیع ترین کام انجام پایا جو موجودہ حالات میں اور کہیں انجام نہیں پا رہا تھا۔

تھانہ بھون کی فضا اللہ والوں کے اجتماع اور ان کی پر خلوص طاعتوں کے باعث ایسی پرنور اور روح پرور ہوگئی تھی کہ جو بھی چند روز یہاں قیام کرتا اس کی کایا پلٹ ہو جاتی، کتنے جنٹلمین یہاں آکر ایسے ہو گئے کہ مولوی بھی ان کے تقوی و طہارت سے شرمانے لگے اور کتنے علماء یہاں پہنچ کر عقلی کاوشوں سے نجات پا گئے اور یقین کامل کے سرمایہ سے مالا مال ہو گئے، کتنے اخلاق کے کچے، معاملات کے کھوٹے یہاں تربیت پا کر معلم اخلاق و معاملات بن گئے کتنے نا آشنائے حقیقت محض کشف و کرامات اور الوان و لطائف کے حصول میں جان کھپانے والے آئے اور یہاں آکر ان پر دین کی اصل حقیقت کھل گئی اور محض ''رضائے الٰہی'' کا حصول ان کا مدعا بن گیا۔

فضا کی اسی کیفیت کو اور مقام کی اسی عظمت کو خسرو ثانی خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے خوب بیان فرمایا ہے اور اپنے چشمِ دید حقایق کا خوب ہی نقشہ کھینچا ہے، خواجہ صاحب شاعر تھے، اس لئے اپنے مشاہدات اشعار میں بیان کئے ہیں ورنہ یہ کوئی شاعری کی باتیں نہیں ہیں، یہ وہ حقایق ہیں جو ہر زائر خانقاہ کے سامنے کھلے ہوئے ہیں، چند شعر سنئے

عجب فرحت گہے ایں خانقاہ است — عجب نزہت گئے ایں خانقاہ است
اگر فردوس بروئے زمین است — ہمیں است وہمیں است وہمیں است
یکے ساقی و میخواران ہزا رند — دو چشم مست او مشغول کا راند
یہ میخانہ بہار است و بہار است — کہ در وجد وطرب ہر مئے گسار است
خوشا ایں بادہ تو شانِ الٰہی — زہے رندی زہے شانِ الٰہی
مپرس از ذاکران نیم شبہا — کہ مشغول اند با لبہا و دلہا
چہ پرسی لطفِ ورد صبح گاہی — کہ ایں لقمہ بہ است از مرغ و ماہی
پر از ذکر است گو ہر ہجر تنگ مست — چہ خوش ایں نغمۂ بے عود و چنگ ست
دل ایں جامی کند اللہ اللہ — کہ ہر دم بشنود اللہ اللہ
چہ صحت بخش است اینجا فضائے — دلِ اینجا بے دوا باید شفائے

تعالیٰ اللہ چہ عالی بارگاہے
کہ اینجا ہر گدائے پادشاہے

کس اینجا سیم و زر آرے ندارد
مگر باکس سرو کارے ندارد

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد
کسے را با کسے کارے نہ باشد

بیا خود ترک کن کبر و منی را
چہ گویم جلوہ ہائے دیدنی را

ز شرح فیض او قاصر زبان است
کہ کشتئے بہ بحر بیکران است

بیا تا دیدہ گرد دایں شنیدہ
شنیدہ کئے بود مانند دیدہ

نہ گویم غیر حق کیں امر دین است
یقین کن ایں ہمہ عین الیقین است

کہ مجذوب ایں ہمہ نشنیدہ گوید
قلندر ہر چہ گوید، دیدہ گوید

جی چاہتا ہے کہ خواجہ صاحب کے اشعار کے بعد مرحوم وصلؔ بلگرامی کے بھی چند شعر ان کی نظم ''مشاہدات'' سے یہاں نقل کئے جائیں جو انہوں نے اپنی تالیف ''ارمغانِ جاوید'' میں درج کی ہے:

مشاہدات

اللہ اللہ یہ مقدر
حاضر ہوں میں ایسے آستاں پر

کاشانۂ فیض جس کو کہیے
خمخانۂ فیض جس کو کہیے

ہر سمت سے اندر آ رہے ہیں
قسمت سب آزما رہے ہیں

ہر رنگ نیا، نیا سماں ہے
شیشوں میں حیات جاوداں ہے

پیمانوں میں روح عجز و ایثار
زہاد سے بڑھ گئے ہیں میخوار

ہر ظرف میں بادۂ شریعت
ہر قطرہ میں جلوۂ طریقت

ابھرے ہوئے سادگی کے جوہر
گردش میں وہی قدیم ساغر

تقوے کی چھل پہل یہاں ہے
مقصود فقط عمل یہاں ہے

شہرت کا یہاں وجود مفقود
ذکرِ نام و نمود مفقود

دنیا سے جدا یہ سرزمیں ہے
کبر و نخوت یہاں نہیں ہے

کوئی بھی یہاں نہیں مقرب
مصروف ہیں اپنے کام میں سب

تدبیر نئی دوا نئی ہے
اصلاح قلوب ہو رہی ہے

تعلیم کا طرز ہی نیا ہے
ہر ایک کی تربیت جدا ہے

بعضوں سے تخاطب و تکلم
اس طرح نوازش و ترحم

بعضوں کو یہی امور ممنوع
ہر شائبۂ غرور ممنوع

تادیب اصول کے مطابق
تجویز مزاج کے موافق

مجلس کی یہاں کا پوچھنا کیا
مجلس ہے کہ فیض کا ہے دریا

انوار کا وہ ہجوم اس میں
وہ ضو افشاں علوم اس میں

ملفوظ کی شان اللہ اللہ
پر کیف بیان اللہ اللہ

اس حسنِ مقال کی کسے تاب
مجلس ہے کہ ہو رہی ہو بیتاب

چھائی ہوئی چار سو تجلی
اٹھتے ہی نگاہ، برق چمکی

اب ہوش کہاں حواس کیسے
صدقے ان ساعتوں کے صدقے

این مجلس فیض بالیقین است
دربار ولئ حق ہمیں است

وہ بیخود و محو و مست ساقی
سرشارِ مئے الست ساقی

وہ اشرفِ اولیائے دوراں
وہ صدر نشیں بزمِ عرفاں

وہ زینت مسند شریعت
وہ ہادی منزل طریقت

وہ نائب خاتم النبیین
وہ صاحب عز و جاہ و تمکیں

جام وحدت پلانے والا
بدعات کا وہ مٹانے والا

وہ حامی دین، امینِ سنت
وہ غوثِ زمان، حکیم امت

وہ کون؟ مجددِ زمانہ
وہ کون؟ محدث یگانہ

اللہ، شان کیا ہے جس نے یہ کہا ہے سچ کہا ہے
خاصان خدا خدا نباشند لیکن زخدا جدا نباشند
ہاں ایک نظر ادھر بھی ساقی کچھ مہر غلام پر بھی ساقی
منہ مانگی مراد وصل پائے محروم نہ تیرے در سے جائے
یہ طالب عزتِ غلامی مقبول حسین بلگرامی
در پر تیرے پڑا ہوا ہے تیرا صدقہ وہ مانگتا ہے
یہ دور یہ میکدہ ابد تک
اے تھانہ بھون تجھے مبارک!!

خانقاہ امدادیہ: کی کیفیت تو آپ نے محسوس کرلی اور اس کی رونق کی ایک جھلک بھی نظروں میں پھر گئی۔ اب ایک اور زائر خانقاہ سے اس کا جغرافیہ بھی معلوم کر لیجئے:

''خانقاہ کی عمارت قصبہ (تھانہ بھون) کی بالکل مغربی سرحد پر ہے، اس کے بعد اس لین میں کوئی آبادی نہیں، کوئی دو فرلانگ پر ٹاؤن کا ریلوے اسٹیشن ہے۔ قصبہ کی اکثر پرانی شان دار عمارتوں کی طرح سڑک بھی پرانی لکھوری اینٹ اور کھڑنجے کی ہے، عین خانقاہ کے دروازہ تک آئی ہے، پھاٹک کے اندر ایک وسیع صحن، کنارے کنارے چاروں طرف پختہ برآمدہ، ٹین کا سائبان۔ اس سلیقہ کے ساتھ کہ آدمی برسات میں ٹین کے نیچے نیچے پورا چکر لگالے۔ نصف صحن کے قریب ایک پختہ حوض کا زیادہ حصہ پٹا ہوا، ایک لمبا حصہ کھلا ہوا، پھاٹک میں داخل ہوتے ہی آپ کو دونوں طرف غسل خانے ملیں گے، چھوٹے لیکن ضرورت کے لئے کافی جاڑوں میں پانی گرم کرنے کا انتظام موجود اور سائبان کے نیچے بالکل متصل کنواں سائبان طے کرکے آپ اندرون دروازہ میں داخل ہوئے، جوتے اتارے کہ صحن مسجد شروع ہوگیا، جوتا رکھنے کے لئے ایک چیڑ کا بڑا بکس کھلا ہوا رکھا ہے۔ اب آپ مشرق سے اپنے بائیں طرف یعنی شمال کی جانب مڑے، یہیں کنواں اس کے آگے بیت الخلا جانے کا راستہ۔ اس کے بعد مہمان خانہ کا زینہ،

مہمانوں کے لئے کمرہ کوٹھے پر سادہ مگر ہوادار گنجائش اتنی کہ چار مہمان ایک وقت میں آسانی سے ٹھہر سکیں۔ زینہ سے چند ہی قدم آگے اور چلے کہ رخ شمال میں چلتے چلتے اپنے داہنے ہاتھ کو یعنی مغرب کی جانب کرنا پڑا اور ایک لمبا برآمدہ ملا، اس برآمدہ میں دو سہ دریاں ہیں پہلی سہ دری کے عقب میں کتب خانہ کا کمرہ، دوسری سہ دری خاص حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نشست گاہ ایک حجرہ اس کے عقب میں، دوسرا حجرہ اس کے مغربی کونہ پر، یہی حجرہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تھا اور ایک کوٹھری اس کے جواب میں برآمدہ کے مشرقی کونہ پر، اب دوسری سہ دری سے نکل کر مسجد میں آگئے۔ مسجد کچھ ایسی بڑی نہیں لیکن بڑی پر رونق اور پرانوار اور ساتھ ہی گنجائشی اور آرام دہ، ختم مسجد کے بعد سالکین کے لئے حجرہ۔ دالان میں ابتدائی تعلیم کے لئے لڑکوں کا مدرسہ قرآنی، خاتمہ پر زینہ اور کچھ اور حجرے، اوپر اور نیچے کے یہ سب حجرے طالبوں کے لئے ہیں۔ اب پھر آپ اپنی داہنی طرف یعنی مشرق کی جانب مڑے اور جنوبی برآمدہ میں آگئے۔ اس کا نصف حصہ مدرسہ اور مہمان کے لئے ہے اندرونی درجہ میں متعدد مہمانوں کی گنجائش، برآمدہ کے دوسرے حصہ میں مدرسہ کی اونچی جماعتیں یعنی ہدایہ خواں طلبہ کی درس گاہ۔ اس کے عقب میں رسالہ ''النور'' کا دفتر حضرت کے بھتیجے اور خانقاہ کے مہتمم و نگراں مولوی شبیر علی صاحب کا کتب خانۂ تجارتی، اس کے بعد آپ شمال کی جانب ایک بار پھر مڑئے اور مشرق میں کنارہ پر چلتے چلتے چند قدم کے بعد دروازہ پر واپس پہنچ گئے حجروں کی قطار ادھر بھی موجود اور وضو کے لئے باقاعدہ نالیاں اس مستطیل کے شرقی ضلع میں شمال سے جنوب تک برابر بنی ہوئی۔'' (حکیم الامت ص ۱۷ تا ۱۹ از مولانا دریابادی مدظلہٗ)

آہ کہ اب یہ مکان، وہ مکان نہ رہا کیونکہ مکیں کو نظریں ترس جاتی ہیں مگر پاتی نہیں

آن قدح بشکست و آن ساقی نماند

انوار: اس خانقاہ پر انوار الٰہی کی جو بارش ہوتی تھی اس کو لوگوں نے محسوس ہی نہیں کیا بلکہ بعضوں نے کھلی آنکھوں اس کا مشاہدہ بھی کیا، حضرت حافظ جلیل احمد صاحب علیگڑھی

(جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے) ایک مرتبہ رات کی ٹرین سے تھانہ بھون آئے، جب ٹرین خانقاہ کے محاذ سے گزر رہی تھی تو انہوں نے صاف دیکھا کہ خانقاہ کی مسجد کے گنبد سے آسمان تک انوار کا تار بندھا ہوا ہے۔

ضبط اوقات وتنظیم کار

دینداری اور ''لا ابالی'' آج کل مترادف الفاظ سمجھے جا رہے ہیں، عقل وفراست سلیقہ وتمیز کا داخلہ گویا دین کی حکمرانی میں ممنوع ہے، اچھے اچھے پڑھے لکھے بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ دیندار کے پاس نہ کسی ضابطہ کی حاجت ہے، نہ قواعد کی ضرورت، اس کے ہاں نہ وقت کی کوئی قدر ہونی چاہیے نہ کام کی کوئی تنظیم، حالانکہ حضور ﷺ کے ایک سچے پیرو سے زیادہ اور کس کی سیرت ہے جو بیک وقت بے تکلفی وسادگی اور نظم وضبط کا جامع نمونہ ہوسکتی ہے؟

حیرت ہے کہ جس ذات والا صفات ﷺ نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ ''**بعثت لاتمم مکارم الاخلاق**'' (میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں) اس کے پیرو آج رہن سہن میں، بول چال میں، لین دین میں اور زندگی کے تمام طور وطریق میں کسی بھی نظم وضبط کے پابند نہ سمجھے جائیں؟ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی (مجددانہ) شان کا یہ وصف بہت ممتاز ہے کہ آپ نے اپنی خارجی وداخلی زندگی کا ایسا اصولی نمونہ پیش کیا کہ دنیا جان گئی کہ اہلِ حق ایسے بھی ہوتے ہیں، اور صاحب دانش مان گئے کہ دین کے مصلح ایسے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن بہت سے ناواقفوں نے اعتراض کیا کہ یہ اصول پسندی تو بالکل انگریزیت ہے کہ ملنے کے اوقات مقرر۔ گفتگو کے طور طریق متعین، یہ بھی کوئی درویشی ہے؟

ع ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کہئے

خانقاہ امدادیہ میں وہ سارے اصول برتے جاتے تھے اور ان پر سختی سے عمل کر دیا جاتا تھا، جن پر ایک استاد وشاگرد اور پیر ومرید کے زیادہ سے زیادہ، افادہ کا مدار ہے۔ یہ اسی اصول پسندی کا اعجاز تھا کہ تنہا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے علمی وعملی وہ وہ نقوش چھوڑے اور

اس کثرت سے چھوڑے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے! اور یہ اہلِ علم جانتے ہیں کہ یہ سب اصول معلم اخلاق ﷺ کی سیرت سے ماخوذ و مستنبط تھے۔

خارجی زندگی

دوسروں کی سہولت اور اپنی راحت کے لئے حکیم الامت نے خانقاہ میں اپنے نظام الاوقات کا اعلانِ ذیل آویزاں کر رکھا تھا:

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اعلان انضباط اوقات احقر!

تا کہ نہ اہل حاجت کا حرج یا تکلیف ہو نہ احقر کا

۱۔ صبح سے بارہ بجے تک مجھ کو متفرق ایسے کام رہتے ہیں جو تنہائی میں ہو سکتے ہیں اس وقت کسی سے ملنے میں یا بات چیت کرنے میں تکلیف بھی ہے اور حرج بھی ہے۔

۲۔ البتہ اوپر کے نمبر سے تین شخص مستثنیٰ ہیں۔ ایک وہ شخص جو تازہ آیا ہو اور صرف ملاقات کا مصافحہ کرنا چاہتا ہو۔ دوسرا وہ جو جا رہا ہے اور صرف رخصت کا مصافحہ کرنا چاہتا ہے۔ تیسرا وہ شخص جس کو ایسی حاجت ہو کہ اس میں مہلت نہیں ہو سکتی مثلاً دردزہ وغیرہ کا تعویز لینا ہو یا فوری ضرورت کا کوئی مسئلہ پوچھنا ہو جس میں تاخیر نہ ہو سکے مگر ان تین شخصوں کو چاہئے کہ آتے ہی کہہ دیں کہ ہمارے اس وقت آنے کی یہ وجہ ہے تا کہ معلوم نہ ہونے سے پریشانی نہ ہو۔

۳۔ پھر بارہ بجے سے نمازِ ظہر سے فارغ ہو کر اپنی مجلس میں بیٹھنے تک میرے قیلولہ و نماز کا وقت ہے اس میں ملاقات سے اور نیز سب خدمات سے معافی چاہتا ہوں۔

۴۔ پھر جب ظہر پڑھ کر اپنی مجلس میں حاضر ہو جاؤں اس وقت سے عصر کی اذان ہونے تک عام اجازت ہے آنے کی بیٹھنے کی ہر قسم کی بات چیت کی، تعویذ وغیرہ مانگنے کی، البتہ جمعہ کا دن تعویز سے مستثنیٰ ہے!

۵۔ پھر اذان عصر سے نماز سے فارغ ہونے تک کے لئے وہی قاعدہ ہے جو قیلولہ کے وقت کا ہے جو نمبر ۳ میں مذکور ہے۔

۶۔ پھر عصر سے فارغ ہونے کے بعد عشاء سے فارغ ہونے تک کے لئے وہ قاعدہ ہے جو صبح سے ۱۲ بجے تک کے وقت کا ہے جو نمبر (۱) میں مذکور ہے اور وہی لوگ یہاں بھی مستثنیٰ ہیں جو نمبر ۲ میں مذکور ہیں۔

۷۔ عشاء کے بعد تو علی الاطلاق معذوری ظاہر ہے، باستثنیٰ اضطرار شدید۔

۸۔ یہ قواعد ان صاحبوں کے لئے ہیں جو مجمع میں اپنا مقصود ظاہر فرما سکتے ہیں اور جو کسی کو کچھ پوشیدہ کہنا ہو۔ اس کے لئے یہ قاعدہ ہے کہ اگر تحریر کو کافی سمجھیں تو میری مجلس سے ملحق سہ دری کی دیوار میں ایک بکس لگا ہے اس میں لکھ کر ڈالیں اور جس موقع پر جواب چاہتے ہوں اس کا پورا پتہ لکھ دیں مثلاً فلاں نمبر کے حجرہ میں یا مسجد کے ممبر پر ہمیشہ بعد نمازِ فجر ایسے پرچے نکالے جاتے ہیں۔ اس طریقہ سے تحریری جواب مل جائے گا اور اگر وہ پوشیدہ بات زبانی ہی کہنا چاہیں تو ایسے ہی پرچہ کے ذریعہ سے تنہائی کا وقت پوچھ لیں۔ میں جو وقت بتلاؤں اس وقت بات کرلیں اور اکثر بعد مغرب کا وقت بتلایا کرتا ہوں۔

۹۔ بعض مہمانوں کو میں خاص اجازت دے کر تنہائی کے وقت میں بٹھلاتا ہوں، دوسرے حضرات اپنے کو ان پر قیاس نہ کریں اور اسی طرح ایک کو کوئی خدمت پنکھا وغیرہ کی کرتا ہوا دیکھ کر دوسرے اس کی تقلید نہ کریں۔ جب تک خاص اجازت حاصل نہ کرلیں، اسی طرح دوسری خدمت بھی بلا صریح اجازت نہ کریں جیسے جوتا اٹھانا یا لوٹا بھر کر رکھنا وغیرہ۔

۱۰۔ راستہ میں بھی کوئی صاحب میرے ساتھ نہ چلیں نہ گھر جا کر پکاریں۔

نوٹ ا: یہ سب قواعد ان صاحبوں کے لئے ہیں جو عقیدت مندی کے ماتحت ہو کر آتے ہیں اور جن کو کوئی دوسرا تعلق بھی ہو ان کیلئے یہ ضوابط نہیں۔ البتہ اگر کسی کو کسی خاص قاعدہ کا پابند کردوں تو اس کو اس کی پابندی لازم ہے۔

نوٹ ۲: کسی وقت ضرورت سے کچھ ترمیم کردوں تو ترمیم ہی پر عمل ہوگا۔ اسی طرح ذاتی ملازموں کے لئے دوسرے ضوابط ہیں جو ان کو زبانی بتلا دیئے گئے ہیں۔

کتبہٗ اشرف علی عفی عنہٗ

اسی طرح نو واردین خانقاہ سے تعارف حاصل کرنے کے لئے آپ نے ایک فارم بنا رکھا تھا جس کی خانہ پری کر کے ضروری تعارف بہ سہولت حاصل ہو سکتا تھا۔ چونکہ آپ مسند ارشاد پر فائز تھے اور ہر پڑھے لکھے اور ہر عامی کے لئے آپ کی تربیت گاہ کھلی ہوئی تھی اور عوام و خواص کا رجوع سینکڑوں کی نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں تھا، اس لئے آپ نے ایسے انوکھے اصول استعمال کئے اور ان کو سکھلایا جن کی وجہ سے زندگی کا سلیقہ وحسن اور اس کی راحت و آسایش ہر ایک کو میسر آ گئی۔

خود حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی اس حکمت کو سنئے:

"بعض حضرت احقر کے پاس خاص مقصد کے لئے تشریف لاتے ہیں جن کی بجا آوری ان کے مفصل حالات ضروریہ کے مطلع ہونے پر موقوف ہوتی ہے، مگر اکثر کا میرے سوال کرنے پر بھی جواب نہیں ملتا یا بہت ہی ناتمام ملتا ہے یا کئی کئی بار کے پوچھنے پر ملتا ہے جس سے طبعاً اذیت ہوتی ہے۔ اور اذیت سے تنگی و کدورت، جو ان کے مقاصد میں مخل ہوتی ہے چونکہ اس کی وجہ پوچھنے پر اکثر نے تصریحاً یہ وجہ بیان کی کہ زبانی سوال سے انتشار ہو جاتا ہے اس لئے سہولت کے لئے ذیل کا نقشہ تجویز کرتا ہوں کہ یہ نقشہ پیش کر دیا کروں اور وہ اس کی خانہ پری خود یا کسی سے کروا کر مجھ کو عنایت فرما دیا کریں۔ جانبین کو اس میں راحت ہوگی۔

نشان شمار	سوال	جواب
۱	نام	
۲	وطن اصلی	
۳	اس وقت کس مقام سے آنا ہوا اور اس مقام میں کتنا قیام رہا؟	

نشان شمار	سوال	جواب
۴	شغل و وجہ معاش؟	
۵	موروثی زمین تو آپ کے پاس نہیں؟	
۶	علمی استعداد اردو یا عربی یا انگریزی میں کس قدر ہے۔	
۷	اصلی مقصد آنے سے کیا ہے محض ملاقات یا کچھ کہنا اور لکھ کر دینا یا زبانی، اور مجمع میں یا تنہائی میں	
۸	کسی سے بیعت ہیں یا نہیں اور کس سے اگر مجھ سے بیعت ہیں تو بیعت کو کتنا زمانہ ہوا اور تعلیم کس سے متعلق ہے۔	
۹	میرے مواعظ اور رسائل کیا کیا دیکھے ہیں۔	
۱۰	اگر مجھ سے کچھ خط و کتابت ہوئی تو وہ پاس ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو دکھلائی جائے؟	
۱۱	کتنا قیام ہوگا؟	
۱۲	کہاں قیام ہوگا؟	
۱۳	خانقاہ میں اول بار آنا ہوا ہے یا پہلے بھی آئے ہیں اگر پہلے بھی آئے ہیں تو کتنا قیام ہوا تھا؟	
۱۴	یہاں کے انتظام طعام کی آپ کو خبر ہے یا نہیں؟	

۱۵	باہر والا بڑا اعلان قلمی [۱] دیکھ لیا ہے یا نہیں؟	

اس کے سوا ہر طبقہ کے افراد کے لئے الگ الگ اصول وضوابط متعین تھے اور سب میں یہی روح کارفرما تھی۔ کہ پیر و مرید، آنے والے اور ملنے والے دونوں کو راحت ملے۔ وقت ضائع نہ ہو اور خوامخواہ کی ملاقاتیں ختم ہو جائیں اب کوئی انصاف سے بتائے کہ کیا یہی نظم وضبط ''انگریزیت'' ہے؟ اور کیا اس انضباط کے بغیر آپ بیسیوں تصانیف، سینکڑوں مواعظ ہزاروں ملفوظات اور روزانہ پچیس پچیس تیس تیس خطوط کے حکیمانہ جوابات دے سکتے تھے؟

خانقاہ کی ڈاک

حکیم الامت کے ہاں ڈاک اس کثرت سے آتی اور روز کے روز اس کا جواب جاتا کہ یہ خود ایک کرامت تھی، اس کی کچھ تفصیل سنئے تا کہ ہماری بات کا یقین آئے:

''ڈاک لانے والی اصل گاڑی سہارنپور کی طرف سے دوپہر یا ذرا قبل تھانہ بھون ٹاؤن کے اسٹیشن پر پہنچتی اور کچھ دیر بعد ڈاک کی تھیلی اسٹیشن سے ڈاک خانہ پہنچ جاتی، کچھ منٹ چھانٹنے میں لگتے اور اس کے بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ڈاک ٹین کے چنگلے میں بحفاظت روانہ ہو جاتی، ڈاک کا اس قدر اہتمام تھا کہ حضرت کے تنخواہ دار ملازمین (یہ تعداد میں عموماً دو رہا کرتے) میں سے ایک صاحب ضرور وقتِ مقرر پر ڈاک خانہ پہنچ جاتے اور ڈاکیہ کے ذریعہ سے تقسیم کا انتظار کئے بغیر اسے لے کر چستی و مستعدی کے ساتھ حاضر خدمت ہو جاتے۔ حضرت کبھی تو اس وقت تک سہ دری میں تشریف رکھتے ہوتے اور کبھی زنان خانہ تشریف لے جا چکے ہوتے، ڈاک آتے ہی جن تحریروں سے حضرت مانوس ہوتے، خصوصاً پوسٹ کارڈ، ان کو اسی وقت پڑھ دیتے اور ڈاک کا جواب اسی کے دو گھنٹہ کے بعد ظہر کی مجلس کے لئے اٹھ رہتا۔ خطوط کی تعداد روزانہ تیس پینتیس

---

[۱] یہ وہی اعلان ہے جو اوپر درج ہو چکا۔

سے کیا کم ہوتی، بعض دن اور زائد، پھر خط بھی مختصر اور چند سطری نہیں بڑے لمبے چوڑے ورفقۂ سلوک، کلام وغیرہ کے مسائل سے متعلق، اب حضرت ہیں اور خطوط کا پشتارہ، ارد گرد حاضرین بزم جلسہ کئے ہوئے، خواص بھی عوام بھی، مسئلے بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے چھڑے ہوئے، حضرت لوگوں سے مخاطب بھی ہیں، حاجت مندوں کو تعویز بھی لکھ لکھ کر دیتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی خط کا جواب اسی کے حاشیہ پر یا بین السطور تحریر کرتے جارہے ہیں جواب کی جامعیت سبحان اللہ، اللہ اللہ دماغ کتنا حاضر پایا تھا، عموماً یہ سارے جوابات اسی طرح قلم برداشتہ لکھدئے جاتے اور اتنے جامع اور محققانہ ہوتے کہ دوسرے سے شاید پورے غور وفکر کے بعد بھی نہ بن پڑتے خال خال خط ایسے بھی ہوتے جن کو جواب کے لئے مولانا دوسروں کے حوالے کر دیتے، یہ وہی خط ہوتے جن میں کتابوں کے حوالہ کی ضرورت ہوتی۔ بارہا ایسا بھی ہوتا کہ یہ انبار ابھی ہٹنے نہ پایا تھا کہ دوسری ڈاک سہ پہر کو دہلی کی طرف سے بھی آجاتی اور دو چار خط اس میں بھی ہوتے۔ جواب کے لئے یہ التزام رہتا کہ حتی الامکان سب دوسرے ہی دن نکل جائیں۔ اگر دن ختم ہو گیا اور ڈاک ختم نہ ہو پائی تو اب مولانا اس سن وسال میں بعد نمازِ مغرب و اورادِ مغرب، لالٹین سامنے رکھ اور قلم ہاتھ میں لے بیٹھ گئے ہیں اور رات گئے تک کام کر کے، ڈاک کو اپنے ہاتھ سے ختم ہی کر کے اٹھے ہیں۔" (نقوش وتاثرات ص ۱۹۵ تا ۱۹۷)

یہ تھا حکیم الامت کا کمال کہ تھوڑے سے وقت میں بے شمار افادہ تحریراً بھی تقریراً بھی اور توجہات باطنی کے ساتھ بھی!!

اصولِ سفر

یہ تو دورانِ قیام کے چند اصول تھے، اب سفر میں دیکھئے، سفر ہو یا حضر آپ نے نہ کبھی فرمائشی وعظ کہے نہ وعظ گوئی کا کوئی معاوضہ قبول کیا بلکہ احتیاط تو اس درجہ تھی کہ جہاں جاتے عام دعوتوں سے گریز فرماتے کہ یہ بھی معاوضہ ہی کی ایک صورت ہے اور اپنے ساتھیوں کا بار کسی پر نہ ڈالتے ہمراہیوں کو اس کی تاکید تھی کہ جب تک میزبان ان

سے بطور خاص درخواست نہ کرے اور وہ حکیم الامت سے اس بارے میں اجازت حاصل نہ کریں، کوئی دعوت قبول نہ کریں، کبھی ایسے مقام پر قیام نہ فرماتے جہاں عام مسلمانوں کو آنے اور ملنے میں دشواری ہو، ایسا بھی ہوا کہ کبھی کسی خوش عقیدہ امیر کے ہاں قیام کا موقع آیا لیکن اس کی صورت بھی یہ رہی کہ اہلِ خانہ کے لئے تو وقت متعین و مقرر رہا اور باقی بیشتر وقت عوام کے لئے خالی رکھا گیا والیان ریاست کی ملاقات سے عموماً گریز فرماتے کیونکہ اس میں نفع کی کوئی امید نہ پاتے تھے۔

حکیم الامت جب سفر کا قصد فرماتے تو پہلے اس کی مقدار و غرض متعین ہوتی۔ پھر اس کے مطابق سامان اور دوسری سہولتیں مہیا کی جاتیں اور اتنے دنوں کے لئے ڈاک کا انتظام پہلے ہی سے فرمالیا جاتا۔ دورانِ سفر ہر جگہ سے گھر کو خطوط لکھتے رہتے تھے۔ تاکہ اہلِ خانہ اور اہلِ خانقاہ مطمئن و بے فکر رہیں۔ سفر میں درجہ سویم کو ترجیح دیتے تھے۔ ویسے جب سہولت ہوتی تو درجہ دوم اور اول میں بھی سفر کرتے تھے۔ دورانِ سفر خطوط کے جوابات اور تصنیف کا کام برابر جاری رہتا تھا۔

سفر کرتے ہوئے جب غیر مسلموں سے گفتگو کی نوبت آتی تو ایسی جامع اور دل نشیں گفتگو فرماتے کہ اہلِ باطل پر اسلام کی حقانیت کا سکہ بیٹھ جاتا تھا۔ البتہ دورانِ سفر کسی کو بیعت نہ کرتے تھے بلکہ اس سے خواہش کرتے تھے کہ تھانہ بھون آکر کچھ عرصہ دیکھ لے، صرف باتوں میں نہ آجائے کیونکہ باتیں بنانا تو بہت آسان ہے اصل شئے عمل و اخلاص ہے جس کے بغیر مقصد بیعت حاصل ہونا محال ہے۔ اس اصول میں دوسری مصلحت یہ تھی کہ لوگ بیعت کو محض رسم اور سستا سودا نہ سمجھ لیں بلکہ اس کی حقیقت و وقعت بھی ان کے ذہن نشین ہو جائے۔ البتہ خواتین اس سے مستثنیٰ تھیں!

یہ حق تعالیٰ کا خاص کرم تھا کہ سفر میں آپ کو کبھی علالت کی نوبت نہ آتی اور تبلیغ و اشاعت دین میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔

داخلی زندگی

خارجی پہلو دیکھ چکے اب مولانا تھانوی کی داخلی زندگی کو بھی دیکھئے تاکہ یہ بات کھل جائے کہ وعظ و پند اصول وضوابط صرف اغیار کے لئے ہی نہ تھے بلکہ گھر کی نجی زندگی میں بھی ان پر پوری پوری نگاہ رکھی جاتی تھی اور اپنے عمل سے ان کی افادیت منوائی جاتی تھی، البتہ ہر موقع ومقام کے لحاظ سے اصول بھی جدا تھے، جیسا کہ ہونا چاہیئے! حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی دو ازواج تھیں، اس لئے جو بھی نقد یا جنس کی شکل میں آتا، مساوی مساوی کر کے اپنے ہاتھ سے تقسیم فرماتے۔ غیرت کا یہ عالم تھا کہ دونوں کے مہر ادا کر دیئے تھے اور باوجود فریق ثانی کی طرف سے معافی و اصرار کے واپس لینا کبھی گوارا نہ فرمایا۔ ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب مدظلہٗ (خلیفہ حضرت حکیم الامت سے جن کو حضرت کی خانگی زندگی سے بہت زیادہ واقفیت ہے) سے احقر نے سنا کہ حکیم الامت کے دو مکان تھے اور دونوں کو اپنی دونوں ازواج کی ملکیت میں دے چکے تھے۔ ان مکانوں کو ہبہ کرنے کے بعد حضرت کو اس سے بھی حجاب آتا تھا کہ بغیر کسی کرایہ کے ان مکانوں میں رہ کر اپنی بیویوں کا منت پذیر ہوں، چنانچہ ایک مرتبہ خوش اسلوبی سے آپ نے یہ بات دونوں کے سامنے رکھ دی کہ ماہانہ کچھ کرایہ لے لیا کریں، اس پر دونوں بگڑیں کہ یہ کیا غیریت کی بات ہے! حکیم الامت نے ہر چند سمجھایا کہ یہ غیریت کی نہیں بلکہ اپنی غیرت کی بات ہے مگر دونوں نے بھی نہ مانا، آپ خاموش ہو گئے مگر پھر رہتے دم تک یہ طریقہ رکھا کہ بلا اظہار خاص کرایہ کی نیت سے کچھ روپیہ دونوں کو دے دیا کرتے تھے، تاکہ ان کے جذبات بھی مجروح نہ ہوں اور اپنی خودداری کو بھی ٹھیس نہ لگے!!

اقبال کرم می گزدار بابِ ہمم را

آپ سخت گیر نہ تھے، کبھی گھر والوں سے تکلف وتحکم کا برتاؤ نہ کیا بلکہ ہمیشہ لطف وکرم سے پیش آتے تھے اور گھر میں بہت ہشاش بشاش رہتے، گویا اس ارشادِ نبوی ﷺ کی تفسیر بن جاتے کہ "تم میں سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے۔" اپنی

ازواج کے مہمانوں کی پوری خاطر مدارت کرتے اور ان کے بچوں سے خوب مزاح فرماتے کیونکہ اپنے سردار و مطاع حضور ﷺ کا طرز یہی تھا۔

اصول برتنے والوں میں ایسے بہت سے دیکھے ہوں گے جو دوسروں پر تو قواعد کی پابندی ضروری سمجھتے ہیں لیکن خود ہر قید و بند سے آزاد رہتے ہیں۔ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ ایسے نہ تھے، پہلے خود پابند ہوتے تھے اور پھر تلقین فرماتے تھے، مولوی شبیر علی صاحب تو آپ کے بھتیجے اور ابتداء ہی سے ہر معنی میں آپ کے زیر تربیت تھے اور ان پر حضرت کو ہر طرح کا حق حاصل تھا، لیکن آپ نے ان کے معاملہ میں بھی کبھی بے اصولی نہ برتی، جب وہ خود آپ کی خدمت میں کسی غرض سے آتے تو کبھی اپنا کوئی کام ان کے سپرد نہ فرماتے، مصلحت یہ تھی کہ آئندہ ان کو آنے میں تکلف نہ ہو اور اس تصور سے کنارہ کشی نہ کرلیں کہ صاحب وہاں جائیں تو کوئی نہ کوئی کام لگا دیا جاتا ہے جب کوئی کام لینا ہوتا تو حضرت خود ان کے پاس جاتے اور فارغ پاتے تو کہہ دیتے ورنہ لوٹ آتے تھے۔ اور یہ تو پھر بھی بھتیجے تھے، اپنی ازواج سے کبھی کھانا کھا کے یہ نہ فرمایا کہ "برتن اٹھالو" بلکہ یہ فرماتے تھے۔ "برتن اٹھوالو۔" تاکہ ان کا وقار متاثر نہ ہو اور جذبات کسی درجہ میں بھی مجروح نہ ہونے پائیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ تھا کہ نوکر اگر دیر سے اٹھتا تو خود اپنے آپ کو عمداً کسی کام میں مشغول فرمالیتے تھے۔ تاکہ وہ اپنے حوائج سے اطمینان کے ساتھ فارغ ہوسکے اور یہ خیال اس کو دامن گیر نہ ہو کہ آپ اس کے منتظر ہیں، اسی طرح اپنے نوکروں کو تاکید تھی کہ خوامخواہ کھڑے نہ ہوں، سلام کر کے بیٹھ جائیں اور اپنا مدعا ظاہر کردیں۔ آپ اپنے ملازموں کو پیسے کبھی پھینک کر نہیں دیتے تھے بلکہ اپنے سامنے رکھ کر ان سے فرماتے کہ یہ اٹھالو تاکہ ایک طرف ان کی تحقیر نہ ہو اور دوسری طرف مال و زر جو اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اس کی قدر ملحوظ رہے۔

اہلِ خانہ پر حتی الامکان بوجھ نہ ڈالتے تھے۔ حتی کہ کبھی کسی خاص پکوان کی فرمائش بھی نہ کرتے تھے۔ البتہ جب خود ادھر سے فرمائش کرنے کا تقاضہ ہوتا تو اس میں بھی ایسا

اسلوب اختیار فرماتے کہ نہ ان کی دل شکنی ہو اور نہ ان پر بار پڑے۔ فرماتے تم ہی چند کھانوں کے نام لو جو بہ آسانی پک سکیں۔ ان میں سے جو مجھے مرغوب ہوگا بتلا دوں گا۔"

باوجود کثرت مشاغل کے روزانہ گھر پابندی سے تشریف لے جاتے تاکہ ان کی خبر گیری و دلداری رہے ان کی بیماریوں پر پوری فراخ دلی سے روپیہ صرف فرماتے اور ضرورت ہوتی تو دور دراز مقامات پر خود لے جا کر علاج کرواتے، اس طرح "تعلق مع اللہ" کے بہانے "حقوق العباد" کو کبھی پائمال ہونے نہ دیتے تھے، یہ تو ان راہبوں یا جوگیوں اور دوکانداروں کا شعار ہے جو سنت نبوی ﷺ سے نا آشنا ہیں، جن کے نزدیک عبادت اور تعلق مع اللہ کا رشتہ اتنا نازک اور کوتاہ ہے کہ مسجد و خانقاہ کے باہر قدم رکھتے ہی تارتار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ سنت کے اتباع میں جو فعل خواہ مسجد و خانقاہ میں ہو، خواہ گھر اور بازار میں عین عبادت اور ترقی قرب کا موجب ہے اور یہی صفت "بے ہمہ و باہمہ" کمال انسانیت کی دلیل ہے۔ ورنہ رہبانیت و جوگیت کونسا مشکل کام ہے۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دیو و در ملولم و انسانم آرزوست

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے دو عقد کر کے عدل و انصاف کی وہ نظیر قائم کی کہ اب لوگوں کے لئے عقد ثانی کی جرأت مشکل ہو گئی، خود فرماتے تھے:

"میں تو ایک کی باری میں دوسری کا خیال لانا بھی خلاف عدل سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے اس کی طرف توجہ میں کمی ہوگی جس کی باری ہے۔ اور یہ اس کی حق تلفی ہے۔ اب میں اپنے کپڑے خانقاہ ہی میں رکھتا ہوں کیونکہ اگر میں ایک گھر میں کپڑے رکھتا تو دوسرے گھر والوں کو شکایت ہوتی کہ ہمارے ساتھ اتنی خصوصیت نہیں جتنی دوسری کے ساتھ ہے۔"

یہ ہے عدل اور خدا ترسی، اور یہ ہے نفس کشی اور بندوں کے حقوق کی پاسداری!!

مجدد ملت کے اس شعار کو غور سے دیکھئے اور جان لیجئے کہ دینداری[1] میں معاشرت[2] و معاملات[3] و اخلاق اتنے ہی مہتم بالشان ہیں جتنے عقائد[4] و عبادات[5]۔ تکمیل دین کے

لئے ان پانچوں پہلوؤں پر یکساں نظر ضروری ہے!

آپ کو سخت رنج ہوتا جب شوہروں کے ظلم و ستم کی روایتیں آپ تک پہنچتیں، آپ ہر ایک کو اپنی بیوی پر مہر و کرم، عفو و درگزر اور پاس و مروت کی تلقین فرماتے تھے۔

توازن طبع

در کفے جام شریعت، در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسنا کے نداند جام و سندان باختن

حق تعالیٰ کی محبت کو جان و دل میں بسا کر پھر بھی اپنے جذبات کو عقل کے تابع اور عقل کو شریعت کے تابع رکھنا کوئی مذاق نہیں یہ صرف کاملین کا حصہ ہے۔ ابتدائی اوراق میں گزر چکا کہ حکیم الامت نسباً فاروقی تھے، آپ کے اندر محبت و غیرت دین اور حسن انتظام و سیاست کی وہی آن موجود تھی جو اسوۂ فاروقی کا طغرائے امتیاز ہے۔ لیکن بعض نادانوں نے آپ کے مزاج کی اسی ''حدت'' کو ''شدت'' و بدخوئی سمجھا اور تنقیدیں بھی کیں[1] حالانکہ یہ ان کی نادانی تھی، حضور اکرم ﷺ کا ارشاد عرفانی تو یہ ہے:

آسمان میں دو فرشتے ہیں ان میں سے ایک سختی کی فرائش کرتا ہے دوسرا نرمی کی اور دونوں صواب پر ہیں۔ ان میں ایک جبرائیل علیہ السلام ہیں اور دوسرے میکائیل علیہ السلام ہیں اور دو نبی ہیں ایک نرمی کا امر فرماتے ہیں دوسرے شدت کا اور دونوں صواب پر ہیں اور وہ ابراہیم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام اور میرے دو صحابی ہیں ایک نرمی کا امر کرتے ہیں اور دوسرے شدت کا وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔'' نیز ارشاد ہے:

''تیزی میری امت کے لوگوں کو پیش آتی ہے اور تیزی کا مستحق بوجہ عزت قرآن

---

[1] مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی سختی کو بہت زیادہ اچھالنے اور مولانا کو سخت گیر مشہور کرنے میں کچھ حصہ خود مولانا کے اکثر معتقدین کا بھی ہے جنہوں نے ان کی سیرت کے پر شفقت پہلو کو یکسر نظر انداز کر کے صرف دار و گیر ہی کے پہلو کو موضوع تذکرہ بنالیا یا خود محتسبانہ روش اختیار کر کے اس کو اتباعِ شیخ سے تعبیر کرنے لگے!

نہ ہر کہ سر بتیر اشد قلندری داند

کے قرآن والے سے زیادہ کوئی نہیں۔'' دیکھنے والوں نے دیکھا اور صبح سے شام اور شام سے صبح تک، مہینوں نہیں برسوں تک دیکھا کہ اگر خلاف دین امور پر آپ برہم ہو جاتے تھے تو دوسری طرف قلبی شفقت کا یہ اثر تھا کہ عام مسلمان پروانہ وار آپ کے اطراف گھر آتے تھے اور جو بظاہر زبان سے جھڑکے جاتے تھے وہ بھی دراصل دل سے کھینچے ہی جاتے تھے بقول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ۔

زباں سے وہ کچھ ہی کہے جائیں مجھ کو
نگہ دے رہی ہے پیامِ محبت

پس تربیت کے لئے اصول صحیحہ کی پابندی میں کسی قدر سختی کا اظہار اصلاح و درستی کی خاطر تھا نہ کہ دل کی قساوت کی وجہ سے، دل کی قساوت کی دلیل تو قرآن پاک نے صاف بتادی ہے کہ ''اے رسول ﷺ آپ ''غلیظ القلب'' ہوتے تو لوگ آپ کے اطراف نہ گھر آتے۔'' یعنی لوگوں کا سمٹ آنا اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اکرم ﷺ کا قلب مبارک شفقت و رافت کے جذبات عالیہ سے معمور ہے۔ ع

تانہ سوز شمع کئے پروانہ شیدا می شود؟

اصل یہ ہے کہ شفقت کے مفہوم اور مقامِ ''ارشاد'' و ''تبلیغ'' کی ذمہ داریوں کو لوگوں نے سمجھا نہیں ہے، حضرت شیخ اکبر (محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں۔

''شفقت و رحمت کے اس کے سوا کوئی معنی نہیں کہ تم اپنے بھائی کو عذاب دوزخ سے نکال کر جنت کی طرف لے جاؤ اور جہل سے علم کی طرف اور مذمت سے حمد کی طرف اور نقصان سے کمال کی طرف منتقل کردو۔ شیخ کے لئے یہ شرط ہے کہ مرید کی ہر لغزش پر جو اس سے صادر ہو تنبیہ و زجر کرے اور اس میں عفو و درگزر کو راہ نہ دے۔ اگر عفو سے کام لیا تو اس مقام کا حق ادا نہ کیا جس مقام پر وہ قائم ہے بلکہ وہ ایک بادشاہ ہے جو اپنی رعیت سے خیانت کرتا ہے اور اپنے رب کی حرمت و عظمت پر قائم نہیں اس لئے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جو شخص ہمارے سامنے اپنا چہرہ ظاہر کرے گا (یعنی جس کا جرم ظاہر ہوگا) اس پر حد قائم کریں گے۔''

اپنے مقام ومنصب کی یہی ذمہ داری تھی جو حکیم الامت کو سختی پر مجبور کرتی تھی ورنہ بارہا آپ نے فرمایا کہ:

"یہ طرز میری طبیعت کے بالکل خلاف ہے، اور مجھے بعد کو بڑی کلفت وندامت بھی ہوتی ہے اور رہ رہ کر سوچا کرتا ہوں کہ بجائے اس طرح کہنے کے اس طرح بھی کہہ سکتا تھا، بجائے یوں سمجھانے کے یوں بھی سمجھا سکتا تھا، بجائے اس تجویز کے یہ تجویز بھی کر سکتا تھا، لیکن عین وقت پر مصلحت اصلاح کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ اور کوئی مصلحت پیش نظر رہتی ہی نہیں۔ اور یہ جب ہی تک ہے جب تک میں نے اپنے ذمہ اصلاح کی خدمت سمجھ رکھی ہے اور اگر کبھی اس سے قطع نظر کر لی تو پھر میں انشاء اللہ تعالیٰ خوش اخلاق بھی بن کر دکھلا دوں گا۔ میرا اصلی مذاق تو یہی ہے کہ کسی سے کچھ تعرض ہی نہ کروں اور اپنے آپ کو سب سے یکسو رکھوں بقول احمد جام رحمۃ اللہ علیہ

احمد تو عاشقی بہ مشیخت تراچہ کار
دیوانہ باش سلسلہ شد شد نہ شد نہ شد

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی شفقت کا تو یہ حال تھا کہ مدتوں بہائم تک کے لئے آپ نے دعا فرمائی ہے تو پھر انسانوں کا اور خصوصاً مسلمانوں کا کس درجہ خیال نہ رہتا ہوگا ترکوں کی شکست پر اپنے درد دل کا یوں اظہار فرمایا تھا:

اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ہمیشہ راحت ہی راحت میں رکھا ہے اس لئے میں نے کبھی یہ نہ جانا کہ غم کیا ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ غم اس کو کہتے ہیں کیونکہ ترکوں کی شکست اور مسلمانوں کی ذلت وخواری کا قلب پر اتنا شدید صدمہ ہے کہ کھانا پینا بھی تلخ ہے۔"

حدود وشریعت کے تحفظ کا یہ حال تھا کہ پورے دو سال کی تحقیق وتفتیش سے اپنے والد ماجد کے ذمہ جو مہر ان کی چار بیبیوں کا رہ گیا تھا ان کے ورثا کا پتہ چلا چلا کر والد مرحوم کے ترکہ سے ادا کیا، اور جب تک ایک ایک پائی ادا نہ ہو لی، چین نہ لیا! یہ ہے عملی وعظ! اگر سب واعظ ایسے واعظ بن جائیں تو آج ملت کے دن نہ پھر آئیں!!

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی نہ عادت تھی نہ آپ کو پسند تھا کہ مخالفین کے اعتراضات

کے جواب دیئے جائیں، حق بات کا اظہار کر کے خاموش ہو رہتے تھے، فرمایا کرتے کہ:

''جب میں سنتا ہوں کہ کسی مناظرہ میں اہلِ بدعت کے مقابلہ میں اپنی جماعت غالب آ گئی تب بھی صدمہ ہوتا کہ عوام کیا کہتے ہوں گے کہ مولوی آپس میں لڑ رہے ہیں، ایسے مناظروں سے عوام کو بہت ضرر پہنچتا ہے اور باطل کو فروغ ہوتا ہے، اگر ان پر التفات ہی نہ کیا جاتا تو ان کی یہ ہمت نہ بڑھتی۔''

اس سے بھی بڑھ کر حکمت آموز اور شفقت آمیز ایک اور بات بھی تھی جس کی وجہ سے آپ خود تو مخالفوں کا کیا جواب دیتے، کوئی مخلص اگر آپ کی طرف سے جواب دیتا تو اس کو بھی پسند نہ فرماتے تھے، ایک مرتبہ مخالفین نے حضرت پر بے سروپا اتہامات لگائے تاکہ آپ کو حکومتِ برطانیہ کا حامی ثابت کیا جائے، محترم مدیر ''سچ'' نے ان کی تردید کی اور سچی بات ظاہر فرما دی ساتھ ہی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اس سے مطلع کیا، جو جواب عنایت ہوا اس کو پڑھیے اور سر دھنیے:

''یہ آپ کی محبت ہے، مگر مجھ کو تو طبعاً اچھا نہیں معلوم ہوتا اس اتہام میں نہ ان کا ضرر نہ میرا، بلکہ جواب دینے میں ان کا یہ ضرر ہے کہ اب تو وہ اتہام میں معذور ہیں اور جب وہ جواب پر مطلع ہو کر قبول نہ کریں گے تو عاصی ہوں گے، تو ایک مسلمان کو عاصی بنانا کیا فائدہ۔'' (حکیم الامت نقوش وتاثرات ص ۲۳۴)

یہ ہے کمالِ انسانیت! پھر یہ بھی کمالِ توازن ہی کا نتیجہ تھا کہ مخالف سے اختلاف خواہ کتنا ہی شدید ہو مگر اس کی خوبیوں پر برابر نظر رہتی تھی، اور جس طرح اختلاف کا اظہار بے باکانہ ہوتا تھا، اسی طرح خوبی کا اعتراف بھی پوری فراخ دلی سے ہو جاتا تھا۔ مولانا محمد علی مرحوم سے حضرت کا سیاسی اختلاف عالم آشکار تھا، لیکن دیکھئے کہ ان کے ''جوہر'' پر بھی کیسی نظر تھی اور اس کا کس بے نفسی سے اعتراف فرمایا ہے۔

''محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے بیان نہیں کر سکتا، خدا جانے کتنی دفعہ دعا کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں، مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اور اس اعتقاد کی بنا پر محبت ہے، صرف ایک صفت، مسلمانوں کی سچی بے غرض محبت ہے، باقی

دوسری صفات، دیکھنے والے جانتے ہیں، میں نے کبھی دیکھا نہیں، اسلئے ایک ہی
صفت سے محبت ہے اور اس کو میں روح الصفات سمجھتا ہوں''
(حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نقوش و تاثرات ص ۱۷۶)

''اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی'' کا کیسا عملی درس ہے!

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے متوازن مزاج اور عاشق سنت ہونے کی یہ بھی دلیل ہے کہ ہر امر میں جہاں تک گنجائش ہوتی سہولت ہی پسند فرماتے تھے کیونکہ حدیث شریف میں صاف موجود ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ کو جب کبھی دو چیزوں میں اختیار دیا گیا تو آپ نے ہمیشہ اسی چیز کو اختیار فرمایا جو ان دونوں میں آسان تھی۔'' راز یہ ہے کہ اس میں اپنی کم طاقتی کا اعتراف ہے اور اپنی درماندگی کا اظہار اور یہی عاجزی و تواضع ''عبدیت'' کا خاصہ ہے!! پھر یہ بھی مخبر صادق ﷺ ہی کا فرمان ہے کہ ''من شاق شاق اللہ علیہ ''جس کی ترجمانی لسان الغیب نے یوں کی ہے۔

گفت آساں گیر بر خود کارہا کز روئے طبع
سخت می گیرد جہاں بر مردمانِ سخت کوش

پھر کیوں نہ سہولت کو محبوب رکھا جائے۔

عام حدود اخلاق کے تحفظ کا یہ حال تھا کہ جب کسی نے ''نجدی مسلک'' اور نجدیوں کے خلاف سخت سست الفاظ میں رد لکھا اور یہ تحریر آپ کی خدمت میں آئی تو صاف صاف لکھ دیا:

''ان رسالوں کے نفع سے غالباً میں محروم رہوں گا جو اہلِ نجد کے متعلق ہیں کیونکہ بوجہ فقدان ذرائع ''مخالفت و موافقت'' میرا مسلک ان کے طرز عمل کے باب میں سکوت ہے اور ذرائع مندرجہ اسایش کی بھی مجھ کو شرعی تحقیق نہیں ہے، ان کے باب میں سکوت ہی ہے، البتہ ان کے مسائل مجھ کو معلوم ہیں ان میں سے بعض میں ان کے ساتھ مجھ کو سخت اختلاف ہے۔ جیسے ''مفہوم شرک میں غلو'' اور ''جیسے توسل میں یا شدرحال میں تشدد'' مگر ان کے رد کے وقت بھی میں سخت الفاظ استعمال نہیں کرتا۔''

مزاج کی ان کی ساری باریکیوں اور اصول پسندیوں کے باوجود، اور ایک دو نہیں سینکڑوں ہزاروں مریدوں اور جاں نثاروں سے ہمدردی وشفقت کا تعلق ہوتے ہوئے بھی، یہ حکیم الامت کا کمال تھا کہ قلب کسی بات میں اٹکا نہ رہتا تھا۔ اور اللہ کی مخلوق سے پوری شفقت ومحبت کے تعلق اور ان کے ادنیٰ سے ادنیٰ حق کی پاسداری کے باوجود آپ کا دل ہمیشہ خالق کی یاد سے معمور اور ہر بات میں اسی کے مشاہدہ سے مسرور رہتا تھا، خود فرماتے تھے:

> ''ان مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ کا جن کی دعا سے میں پیدا ہوا ہوں، یہ اثر ہے کہ کسی میں دل اٹکا ہوا نہیں، یوں اپنے متعلقین واحباب سے بے حد محبت ہے۔ لیکن یہ نہیں کہ کسی کی مفارقت سے پریشانی ہو اور دھیان لگا رہے۔ بس تھوڑا سا افسوس ہوتا ہے۔ الحمد للہ میرے قلب میں ''حرارت'' ہے۔ ''قساوت'' نہیں اور مزاج میں ''حدت'' ہے ''شدت'' نہیں!''

صاحب جلال اور صاحب جمال بزرگ تو پھر بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن صاحب توازن واعتدال' صدیوں ہی میں پیدا ہوتے ہیں!

تبلیغ واشاعتِ دین

مجددین کا ظہور

خیرالقرون کے بعد سے یہ تو ہوتا ہی آیا ہے کہ شریعت اسلامی کے صاف و بے داغ چہرہ پر جہلا اور دنیاداروں نے خاک ڈالنے کی کوشش کی ہے، اور اپنے اپنے وقت پر ہر جگہ مجددین نے اس گردوغبار کو صاف کر کے شریعت کے حقیقی حسن و جمال کو دکھایا ہے۔ پہلی صدی میں عمرابن العزیز حسن بصری یا امام باقر وغیرہ۔ دوسری صدی میں امام شافعی یا یحییٰ بن معین امام الجرح والتعدیل۔ تیسری میں حافظ ابن شریح، امام ابوالحسن اشعری یا نسائی صاحب سنن نسائی۔ چوتھی میں امام باقلانی، امام سہل بن باابوحامد یا حاکم صاحب مستدرک پانچویں میں امام اغزالی۔ چھٹی میں امام رازی ورافعی۔ ساتویں میں ابن وقیق العبدوابن تیمیہ۔ آٹھویں میں امام بلقینی یا حافظ زین الدین عراقی، نویں میں سیوطی۔ یا امام سخاوی، دسویں صدی میں شمس الدین بن شہاب الدین۔ گیارہویں میں شیخ احمد سرہندی۔ ابراہم بن حسن کروی نزیل مدینہ۔ بارھویں میں شاہ ولی اللہ دہلوی شیخ صالح محمد بن نوح نزیل مدینہ۔ تیرھویں میں مولانا سید احمد بریلوی۔ و مولانا اسمٰعیل شہید۔ (رحمہم اللہ علیہم اجمعین[1]) یہ سب حضرات اسی مقام اعلیٰ پر فائز رہے۔ اور اپنے اپنے دور میں ان بزرگوں نے عجمیت، بدعات اور رسوم واوہام کی بیخ کنی کر کے سنت مطہرہ کو زندہ کیا ہے۔ ان کے کاموں ہی سے اہلِ تقویٰ وفراست نے ان کے ''مجدد'' ہونے کا گمان غالب کیا ہے۔ ورنہ کسی مجدد کا مجدد ہونا کوئی ازعانی اور یقینی مسئلہ نہیں اور نہ کسی مجدد نے اپنی شخصیت کی کبھی دعوت دی ہے اور جس کسی نے ایسا کیا ہے وہ باطل ہے کیونکہ مجدد

[1] تفصیل کے لئے دیکھو، مقدمہ جامع المجددین

کو مجدد ماننا ایمان کا ادنیٰ جزو بھی نہیں ہے۔

ع ہشدار کہ راہِ خود گم نہ کنی!

پھر یہ کہ ہر صدی میں اس مسئلہ کے تعین میں نیک نیتی سے دو شخصوں کی رائیں حسب عقیدت و محبت مختلف رہی ہیں اور رہ سکتی ہیں، ان میں سے کسی ایک پر ایراد و اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن پھر سوال ہوتا ہے کہ اس ظنی و قیاسی مسئلہ پر کسی درجہ میں بھی زور دینے کی وجہ آخر کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجدد وقت کو نہ پہنچاننے اور اس کو اپنا رہبر نہ بنانے کی وجہ سے کتاب و سنت کی صحیح ترجمانی اور پوری پوری پیروی سے اکثر محرومی رہتی ہے اور بدعات و فسادات کے دلدل سے نکلنا دشوار ہوتا ہے اور مسلمان ٹھیک صراطِ مستقیم پر رہ نہیں سکتا جو نہایت ضروری چیز ہے اور جس پر ثمرات دینی کا مدار ہے، اگر اس مسئلہ کو اتنی اہمیت بھی نہ ہوتی تو مخبر صادق ﷺ یہ بشارت نہ دے جاتے کہ ''بے شبہ اللہ تعالیٰ میری امت میں ہر صدی کے سرے پر ایسے کو پیدا کرے گا جو اس کے لئے اس کے دین کو نیا کر دے گا۔''

چودھویں صدی میں مجدد

تیرھویں صدی میں مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے پیر حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مساعی کے بعد ہندوستان میں پھر علی العموم بدعات و رسوم کو فروغ ہو چلا تھا۔ طریقت و حقیقت کے نام سے زندقہ پھیل رہا تھا۔ ادھر دوکاندار صوفیا کے ڈھونگ سے تو تعلیم یافتہ طبقہ میں دین سے تنفر پیدا ہو رہا تھا۔ ایسے میں رحمت باری کو پھر جوش ہوا اور اس نے تھانہ بھون کی خاک سے ۱۲۸۰ھ میں ایک ہستی پیدا فرمائی۔ جس نے ۱۳۰۱ھ میں مسند ارشاد پر آ کر ۱۳۶۲ھ تک اپنی زبان و قلم اور علم و عمل کے ذریعہ خاتم الانبیاء ﷺ کے نقوش کو پھر سے اجاگر کرنے کی کامیاب سعی کی۔

آپ کی ہمہ گیر اصلاحات سے آپ کی حیات ہی میں لوگوں کو آپ کے مجدد وقت ہونے کا گمان ہو چلا تھا، ایک مولوی صاحب نے ایک مرتبہ جرأت کر کے خود حکیم الامت

سے یہ بات پوچھی، جواب ملا:

''چونکہ نفی کی بھی کوئی دلیل نہیں، اس لئے اس کا احتمال مجھ کو بھی ہے، مگر اس سے زیادہ جزم نہ کرنا چاہئے۔ محض ظن ہے اور یقینی تعین تو کسی مجدد کا نہیں۔''

مسئلہ تجدید کی نوعیت و نزاکت کو سمجھنے اور اس حکیمانہ ملفوظ کو سننے کے بعد اب تو شبہ نہ رہا ہوگا کہ ''مجددیت'' کو منوانے کی کوشش کرنا ہر طرح نا مناسب اور فیوض و تعلیماتِ اشرفیہ کی اشاعت کو محدود و محصور کرنے کے مترادف ہے! تعلیمات اشرفیہ جوں کی توں پیش کر دیجئے دنیا خود اس کی ندرت و عظمت کی قائل ہو جائے گی:

عطر آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

وعظ کے ذریعہ تبلیغ

حکیم الامت کے قلمی و علمی کارناموں کا ذکر گزشتہ باب میں ہو چکا ہے، یہاں صرف لسانی و عملی حصہ کا ذکر مقصود ہے۔ آپ کا پہلا وعظ خود آپ کے والد ماجد کی فرمائش پر شاید اٹھارہ برس کی عمر میں جامع مسجد تھانہ بھون میں ہوا۔ جس کی تفصیل خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی یہ ہے۔ ''سب سے پہلا وعظ میں نے جہاں تک مجھ کو یاد ہے والد صاحب کے حکم سے کہا تھا۔ جبکہ میری شادی ہوئی تھی والد صاحب تو تقسیم طعام کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے انہوں نے تو حوض والی مسجد میں جمعہ پڑھا میں اور ماموں واجد علی صاحب جامع مسجد میں جمعہ کے لئے گئے والد صاحب نے ماموں صاحب سے فرما دیا تھا کہ نماز کے بعد وعظ کا اعلان کر دیں چنانچہ انہوں نے اعلان فرما دیا میں بڑا گھبرایا کہ وعظ کیونکر کہوں گا۔ میں نے ماموں صاحب سے عرض کیا کہ آپ نے اعلان کیا ہے تو آپ ہی وعظ فرمائیں۔ فرمایا تم کو کہنا ہوگا۔ بالآخر میں مجبور ہوا ممبر کے اوپر تو نہیں بیٹھا بلکہ نیچے کے حصہ پر بیٹھ گیا۔ اور سر جھکا کر ''الم ذالکتاب لا ریب فیہ'' چند آیتیں پڑھ کر ان کا ترجمہ کیا اور تھوڑی دیر مطلب بیان کر کے ختم کر دیا۔ اس کے بعد جو مسجد سے باہر نکلا تو مجھے ماموں صاحب نے آگے چلنے کو فرمایا میں نے عذر کیا آپ سے آگے کیوں کر چل سکتا

ہوں، فرمایا اب تم مقتدا ہو گئے اور مقتدا کا احترام ضروری ہے، اگر ہم گھر کے آدمی ہی احترام نہ کریں گے، تو دوسرے کیوں کر احترام کریں گے۔ اس لئے میں حکم دیتا ہوں کہ تم آگے چلو حکم سے مجبور ہو کر مجھے آگے چلنا پڑا۔ وہ میرے پیچھے چلے اللہ اللہ، پہلے بزرگوں کو مصالح پر کیسی نظر تھی پھر رات کو مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا مولانا بڑے خوش تقریر تھے۔ مجھے مولانا سے بہت محبت تھی اور مولانا بھی مجھ سے بہت محبت فرماتے تھے۔ مجھے مولانا کے انتقال کا بہت رنج تھا، میں نے خواب میں بھی یہی عرض کیا کہ مجھے آپ کے انتقال سے بہت رنج ہے، فرمایا میں تو اب بھی تمہاری طرف اسی طرح متوجہ ہوں جیسا کہ زندگی میں تھا۔ اسکے بعد میرے کسی وعظ میں رکاوٹ نہیں ہوئی، اور پھر تو ہم "سراج الواعظین" ہو گئے! (دیکھو "بزم جمشید")

پھر تو شہر بہ شہر اور قریہ قریہ میں وعظ ہوتے رہے اور یہ حالت رہی کہ:

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

ہندوستان کے اکثر چھوٹے بڑے شہروں اور ریاستوں کے دارالخلافوں میں آپ کے وعظ ہوئے اور ہر جگہ ان کی برکت سے دکاندار مشائخوں کے بازار سرد ہو گئے، ان کے گاہک کم ہو گئے، تو تعلیم یافتہ لوگوں کی آنکھیں کھلیں، انہیں دین کی صحیح تصویر نظر آئی، ان کے شکوک وشبہات رفع ہو گئے اور دین کے حقیقی جلوہ نے ان کے دلوں کو موہ لیا نتیجہ یہ کہ سینکڑوں جنٹلمین عاشق رسول ﷺ ہو گئے۔ مواعظ کی پر تاثیری کا ثبوت اس سے زیادہ کیا چاہئے کہ جس شہر میں چند وعظ ہوئے مسجدیں آباد ہو گئیں۔ قلوب ذوق اتباع سنت سے معمور ہو گئے۔

سو سو کو مست کرتے ہیں اک اک نگاہ میں
جس بزم میں گئے اسے میخانہ کر دیا

آج بھی جو کوئی کم از کم خالی الذہن ہو کر ہی ان مواعظ کا مطالعہ کرے تو دل میں

دین کی عظمت و محبت پیدا ہو جاتی ہے، صراط مستقیم پر چلنے کی ہمت آجاتی ہے اور دنیائے دوں سے گھن آنے لگتی ہے!! نظر مخلوق سے ہٹ کر خالق پر جم جاتی ہے اور مقصود زندگی صرف اللہ ہی اللہ رہ جاتا ہے!!

انگلستان میں بالواسطہ تبلیغ

آپ کی تبلیغ گو ہندوستان کی حد تک خاص تھی لیکن اس کے بالواسطہ اثرات افغانستان وایران بلکہ انگلستان تک پہنچ گئے تھے، چنانچہ آپ ہی کے ایک ہم وطن معتقد، مرحوم حبیب احمد تھانوی یورپ گئے ہوئے تھے۔ ان کی زبانی اسلام کی خوبیاں سن سن کر کچھ انگریز عیسائی مسلمان ہوگئے۔ ان میں بعض اعلیٰ خاندان و طبقہ کے لوگ بھی تھے۔ چونکہ حبیب احمد صاحب حکیم الامت سے خط و کتابت رکھتے تھے اس لئے بعض انگریزوں نے حضرت سے اپنے نام بھی تجویز کرائے۔ حکیم الامت کی ہر ادا حکمت آمیز و حکمت آموز تھی، ایک لیڈی پروفیسر جس کا نام "براڈے" تھا۔ جب وہ مسلمان ہوگئی تو آپ نے انکا اسلامی نام "بریدہ" (کٹ کر آئی ہوئی۔ مراد کفر سے اسلام کی طرف) رکھا جس سے وہ بڑی خوش ہوئی کہ تلفظ کی دقت بھی باقی نہیں رہی اور نام اسلامی ہوگیا، اسی طرح ایک اور انگریز خاندان مسلمان ہوا اس کو حکیم الامت سے اس درجہ محبت ہوئی کہ ہندوستان آکر نیاز حاصل کئے بغیر چین نہیں آیا۔ صدر خاندان کا نام شیخ فاروق احمد تھا، یہ تعلیمات اسلامی سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اپنی وضع قطع اور پوشاک تک بالکل بدل ڈالی!

حبیب احمد صاحب کے ذریعہ آپ کا فیض انگلستان میں اسی طرح پہنچتا رہا، جب کچھ امیدیں زیادہ بندھیں تو مرحوم نے حضرت کو انگلستان آنے کی دعوت دی تاکہ تبلیغی کام پوری قوت سے ہوسکے، آپ نے عزم فرمالیا اور اپنے ساتھ ایک انگریزی داں رفیق کو بھی منتخب فرمالیا اور احتیاطاً داعی کو لکھ بھیجا کہ:

"اگر میرے طرز تبلیغ اور جوابات سے وہاں کے لوگوں کو تشفی ہوتی ہو اور نفع کا قوی امکان ہو تو یہ سفر اختیار کروں گا، ورنہ مناسب نہیں۔"

لیکن حق تعالیٰ کو منظور نہ تھا کہ انگلستان کی تاریکی دور ہو، آپ کے اس خط کا جواب آنے نہ پایا، اور حبیب احمد صاحب تھانوی راہئی ملکِ بقا ہو گئے اور حضرت نے ہمیشہ کے لئے ارادہ ترک فرمادیا۔

تبلیغ کی تاکید اور مجلس ''دعوۃ الحق''

آپ کی تمنا تھی کہ تبلیغ کا اہتمام بھی تعلیم کی طرح لازمی کردیا جائے چنانچہ مدارس دینیہ کو ہمیشہ اس طرف متوجہ فرماتے رہے اور اپنے مدرسہ میں خود بھی اس پر عامل رہے، فرماتے تھے:

نصوص کثیرہ صلاح کے ساتھ دوسروں کی اصلاح کی تاکید بھی وارد ہے اور سورۂ والعصر تو بلاشرکت خاص اس موضوع کے لئے نازل ہوئی ہے اس میں جہاں تصحیح عقائد و اصلاح اعمال کو نجات کی شرط فرمایا ہے جو حاصل ہے خسران سے بچنے کا، وہیں ''وتواصوا بالحق و تواصو بالصبر'' میں دوسروں کی تعلیم عقائد واعمال کو بھی شرط نجات میں داخل فرمایا ہے اس کے علاوہ قرآن وحدیث میں اسی مضمون کے اور بے شمار نصوص امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور وعظ وتذکیر کے عنوان سے نہایت تاکید اور اہتمام کے ساتھ مذکور ہیں اور اس میں سستی وترک پر شدید وعیدیں بھی وارد ہیں۔ نیز انبیاء علیہم السلام کا خاص فریضہ یہی رہا ہے باقی دین کے جتنے شعبے ہیں مثلاً افتاء درس وتصنیف وغیرہ سب اسی کے آلات ومقدمات ہیں، خود تنظیم (یا حکومت) جس کی ضرورت سب کو تسلیم ہے۔ اسلام میں وہ بھی اسی کے تابع اور اسی کا مقدمہ ہے۔ چنانچہ اس آیت الذین امکنا ھم فی الارض الخ میں جہاں تمکین کے مقاصد ذکر فرمائے ہیں ان میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو بھی جزو مقصود فرمایا گیا ہے۔

غرض اسی اہمیت کے پیش نظر رسالہ ''حیوۃ المسلمین'' بڑی تحقیق وتدقیق سے تصنیف فرمایا اور اس کی اشاعت کے بعد لوگوں میں تبلیغ واشاعت دین کی ایک خاص صورت بھی تجویز فرمائی اور ''مجلس دعوت الحق'' کے نام سے اس کا ایک تنظیمی خاکہ مرتب فرمایا۔

۱۔اس مجلس دعوۃ الحق کا مقصد تعلیم المسلمین[۱] و تفہیم المسلمین[۲] کی عملی ترویج کے ذریعہ مسلمانوں میں دینی جذبہ پیدا کرنا اور کامیابی کا راستہ بتلانا ہے، جو مسلمانوں کے لئے تعلق مع اللہ میں منحصر ہے اور اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی پوری پابندی کی جائے۔تا بہ امکان کوئی بات خلاف شرع نہ ہونے پائے۔یہی عبدیت کی روح اور مسلم کی زندگی کا اصل اصول ہے۔"

اس مقصد کے لئے مندرجہ ذیل نظام العمل مرتب فرمایا:

(۱) تعلیم المسلمین و تفہیم المسلمین کی تمام دفعات کی نہایت خلوص و استقلال کے ساتھ ہمیشہ پابندی کرتے رہیں اور ہر امر میں اصلی مطمح نظر رضائے حق ہو اور اس استقلال و ہمت کے ساتھ ہی دعا و ابتہال کو اصل وظیفہ و تدبیر سمجھیں۔"

(۲) جہاں تک ہو سکے قرآن شریف کا ترجمہ سننے کا بھی اہتمام کریں۔

(۳) مسلمان کا فرض ہے کہ ہر موقع پر جذبات کو شریعت کے تابع رکھے۔

(۴) اخلاق اسلامی کو اپنا شعار بنائے، وضع و معاشرت کو بالکل شریعت مقدسہ کے موافق رکھے نہ انگریزوں کی تقلید کرے نہ ہندوؤں کی نہ کسی اور کی۔

(۵) انبیاء علیہم السلام کا مسنون طریقہ تھا کہ ہاتھ میں لاٹھی رکھتے تھے اس واسطے سب مسلمانوں کو اس سنت پر کاربند رہنا چاہئے۔

(۶) خدمت خلق کا خیال رکھیں، محنت و جفاکشی کی عادت کیلئے ورزش بھی کیا کریں، نیز لکڑی وغیرہ چلانا بھی سیکھیں اور سادہ و سپاہیانہ زندگی بسر کریں۔یہ مطلب نہیں کہ خواہ مخواہ کسی سے لڑیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ آرام طلبی میں نہ پڑیں۔مخدوم نہ بنیں خادم بننے کی کوشش کریں۔اگر کسی انسان بالخصوص مسلمان کی مدد کرنے کی ضرورت ہو تو مظلوم کی امداد کو لازم جانیں۔

(۷) ہر مسلمان روزمرہ نماز عشاء کے بعد سونے سے پیشتر اپنے گناہوں کو سوچ کر یاد

---

[۱] [۲] یہ دو رسالے ہیں جن میں وعظ اور واعظ کے دستور العمل مرتب کئے گئے ہیں۔

کرے اور پھران نعمتوں کو یاد کرے جو حق تعالیٰ کی طرف سے اس پر ہیں اوران دونوں کو یاد کر کے اپنے کو ملامت کرے کہ جس مالک کی اس قدر نعمتیں ہیں اس کی ایک دن میں مجھ سے کس قدر نافرمانیاں ہوئیں۔ اس کے بعد دل سے ان سب گناہوں سے توبہ واستغفار کر کے سوئے روزانہ بلا ناغہ یہ عمل کرے۔''

اسکے بعد بعض خاص دعائیں درج کر کے ہر نماز کے بعد ان کو پڑھنے کی تاکید فرمائی ہے۔

خود آپ نے اپنی حیات میں انہیں اصول کے ماتحت مبلغین مقرر فرمائے تھے جن کی وجہ سے سہارنپور اور اسکے اطراف میں خصوصاً اور کل ملک میں عموماً بڑا فائدہ پہنچا، آریوں کی ریشہ دوانیاں ختم ہوئیں۔ اور ارتداد کا سیلاب ختم ہوگیا مولوی عبدالمجید صاحب۔ بچھرایونی خاص طور پر اس میدان کے شہسوار اور غازی رہے!

دعوت الحق کے نظام العمل اور اس کے طریق کار کے سلسلہ میں یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ پوری اسکیم ایک مجبورانہ ماحول میں بنائی گئی تھی اور خود مولانا تھانوی رحمۃاللہ علیہ کے بھتیجے مولانا شبیر علی صاحب سے، جن کے ہاتھوں تعلیم المسلمین اور تفہیم المسلمین کے دفعات لکھوائے گئے، راقم نے سنا ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کئی مرتبہ کی کانٹ چھانٹ کے بعد اس وقت کے حالات کے پیش نظر جہاں تک ممکن العمل نظام بن سکتا تھا پیش فرمایا۔ ورنہ مقصود تنظیم تو اس سے بھی زیادہ عظیم تر تھا، اور وہ ہر مسلمان کو تسبیح و سجادہ کے ساتھ ساتھ شمشیر و سناں سے مسلح دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے اب پاکستان کی ایک گونہ آزاد فضا میں ضروری نہیں کہ تعلیم المسلمین وغیرہ کے دفعات کو لفظاً لفظاً ضروری و اہم سمجھا جائے بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ مجلس دعوۃ الحق کی روح کو قائم رکھتے ہوئے اس کے طریق کار میں ضروریاتِ وقت کے مطابق ترمیم کی جائے اور یہ کام حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مذاق آشنا، اہلِ رائے حضرات کا ہے!

تبلیغی جماعت سے قلبی تعلق اور بشارت

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کو مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تبلیغی جماعت

سے دلی لگاؤ تھا اور اس سے بڑی امید رکھتے تھے۔ اسی لئے باوجود اس جماعت کے طریق عمل سے قدرے اختلاف ہونے کے اپنے بعض خدام کو اس میں شریک ہو کر کام کرنے کی تاکید فرمائی تھی، اپنے ایک فرستادہ کے ایک عریضہ کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

حالات سے بہت کچھ امیدیں ہوئیں اور مجھ کو اس سے پہلے بھی آپ جیسے مخلصین کا جانا اور پھر مولوی محمد الیاس صاحب کا ساتھ ہو جانا کامیابی کا یقین دلاتا تھا۔ علم غیب تو حق تعالیٰ کو ہے مگر میرا قلب شہادت دیتا ہے کہ انشاء اللہ سب وفود سے زیادہ نفع آپ صاحبوں سے ہوگا۔ بخدمت مولوی محمد الیاس صاحب۔ سلام مسنون!''

دستور ہند میں قضاۃ کے تقرر کی کوشش

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا بڑا خیال تھا کہ ہندوستان میں سابقہ دستور کے مطابق قضاۃ کا تقرر ہو جائے اس کے لئے آپ نے پوری سعی فرمائی، پہلے تو حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (سابق مہتمم مدرسہ عالیہ دیوبند) کے ذریعہ مسٹر مانٹیگو وزیر ہند تک اس کی ضرورت کی اطلاع پہنچائی اور پھر بعض ممبروں کو اسمبلی اور کونسل میں اس مسئلہ کے پیش کرنے کی ترغیب دلائی اور بعض ذرائع سے یہ بات ''سائمن کمیشن'' کے سامنے بھی لائی گئی۔ اسی سلسلہ میں آپ کے ایماء پر میرٹھ میں ''انجمن نصب القضاء'' قائم ہوئی جس سے ''القول الماضی'' وغیرہ کے سے رسالہ شائع کر کے عوام میں اس کی اہمیت کا شعور پیدا کیا۔ پھر ۱۳۴۷ھ بمقام دہلی ایک جلسہ منعقد کروایا جس میں تمام ممبران اسمبلی اور عمائدین شہر کے علاوہ حضرت انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد علی جوہر اور سہارنپور اور دیوبند کے بعض اور ممتاز علماء شریک تھے۔ خانقاہ امدادیہ کی طرف سے مولانا عبد الکریم صاحب نے شرکت کی۔ اس جلسہ سے ممبران اسمبلی پر قیام قضاۃ کی اہمیت و ضرورت واضح ہوگئی، لیکن یہ ساری کوششیں نتیجہ خیز نہ ہو سکیں۔

آخری دور

۱۳۳۷ھ تک ہندوستان کے اکثر مقامات اور شہروں میں پیغام حق کی منادی کر کے

اب وقت آیا کہ آپ ہمیشہ کے لئے خانقاہ امدادیہ ہی میں عزلت نشین ہو جائیں فتق (Hernia) کا عارضہ لاحق ہوا۔ اطباء نے سفر کی قطعاً ممانعت کر دی۔ آپ نے اعلان فرمادیا کہ اب کوئی دعوت سفر نہ دے۔ اس طرح "فسبح بحمد ربک واستغفره" والا دور شروع ہوا اور اس اسوۂ رسول کریم ﷺ کے اتباع کی توفیق بھی میسر آئی ویسے تادم آخر زائرین خانقاہ کو ملفوظات کے ذریعہ اور دوسرے طالبین کو مکتوبات کے ذریعہ برابر مستفیض فرماتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب آپ کے چلنے پھرنے کی ضرورت بھی کیا رہ گئی تھی۔ ساٹھ برس کی جدوجہد اور صرف ہمت سے ہزاروں کی سیرتیں بن چکی تھیں، سینکڑوں "سیرت گر" تیار ہو چکے تھے جو ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے اپنی اپنی جگہ تبلیغ و رشد میں مصروف تھے! چنانچہ راقم نے یہ روایت دو شاہد عادل[1] سے سنی ہے کہ جب حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہٗ کا تعلق خانقاہ اشرفیہ سے قائم ہو گیا تو خود حکیم الامت نے کئی بار فرمایا کہ "اب میرا کیا کام ہے بحمداللہ اب مجھے اطمینان ہے کہ میرے مذاق کو سمجھنے والے اور اس کو پھیلانے والے موجود ہیں۔"

---

[1] حاجی محمد عثمان خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ڈاکٹر عبدالحئی صاحب مدظلہٗ

مربیانہ شان

ہزار نکتۂ باریک تر زمو اینجاست
نہ ہر کہ سر تیراشد قلندری داند

تربیت روحانی کوئی آسان کام نہیں حقیقی طبیب روحانی بڑی مشکل سے ملتے ہیں عطائی اور دوکاندار مشائخوں کی البتہ کمی نہیں اور یہ انہیں کی کثرت کا نتیجہ ہے کہ درویشی کی تعلیم کے ابواب حال وقال عرس و چراغاں اور نذر و نیاز سمجھے جانے لگے ہیں پھر اگر اس عجیبت کو دیکھ کر اقبال مرحوم نے کہا۔ ع

''کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی''

تو کیا ہوا۔ اس میں مرحوم تنہا نہیں خود ہمارے اکابر کی زبان سے بھی ایسی خانقاہوں کے بارے میں اس سے زیادہ سخت الفاظ نکلے ہیں۔

یارب سبیل حادثہ طوفاں رسیدہ باد
تبخانۂ کہ خانقہش نام کردہ اند

اور عراقی نے فرمایا ع ''چو بہ صومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی''۔ ان اشعار میں ایسی ہی خانقاہ کو صومعہ اور تبخانہ سے تعبیر کیا گیا ہے، لیکن جیسا کہ پچھلے کسی عنوان کے تحت ثابت کیا جاچکا ہے کہ ان دوکانداروں کے فروغ اور ان کے ہاتھوں خانقاہی تعلیم کے مسخ ہو جانے سے نفسِ خانقاہیت کا انکار لازم نہیں آتا کیونکہ یہ تو ہر جگہ اور ہمیشہ ہی ہوتا آیا ہے کہ غلط افراد کی وجہ سے اچھے ادارے بھی اپنا مقصود اصلی کھو بیٹھتے ہیں۔ مگر ان کی اصلاح اسی طرح ہوتی رہی ہے کہ صلاحیت رکھنے والے افراد نے ان کی زمام اپنے ہاتھوں میں لے لی اور ان کو ہر عیب سے پاک کر دکھایا۔ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی پھر ایک بار ''خانقاہ'' کو

اس کے اصلی رنگ میں پیش کیا اور "سیرت سازی" کا وہ صحیح طرز اختیار فرمایا کہ جوگیانہ صوفیت اور زاہبانہ تربیت کے پردے تارتار ہو گئے۔ اسلامی روحانیت کا مفہوم کھل گیا اور اس کے پیکر نظر آنے لگے۔

ظاہر و باطن دونوں پر شریعت حاکم ہے

آپ نے اس حقیقت کو پورے زور سے ظاہر فرمایا کہ شریعت ہی ساری دنیوی و اخروی ظاہری و باطنی سعادتوں اور کامرانیوں کی کفیل ہے۔ اور اپنے اس دعویٰ کو مختلف دلائل سے ثابت کیا اور طرح طرح کی مثالوں سے واضح فرمایا چنانچہ محض ظاہر پر اکتفا کرنے والوں اور نرے باطن کے دعویداروں کی اصلیت ایک وعظ میں یوں ظاہر فرمائی ہے:

"ایک جماعت نے روح کی طرف التفات نہیں کیا اور ایک نے صورت کی طرف لیکن پھر بھی ان دونوں میں تفاوت عظیم ہے جنہوں نے روح کی طرف التفات نہیں کیا، انہوں نے روح کا انکار نہیں کیا اور جنہوں نے صرف روح کو لیا انہوں نے صورت کا انکار کیا نیز جنہوں نے روح کی طرف التفات نہیں کیا وہ روح کو بالکل چھوڑے ہوئے نہیں ہیں یہ ایک باریک بات سمجھنے کے قابل ہے یعنی روح کے درجات طبقات ہیں جیسے انسان زندہ ہوتا ہے روح حیوانی سے اور اس کے مراتب مختلف ہیں مثلاً ایک پہلوان کی روح اور ایک مدقوق کی روح میں فرق ہے مدقوق بھی روح سے خالی نہیں گو روح ضعیف سہی اسی طرح اعمال کی روح کو سمجھو۔ منکرین ظاہر کہتے ہیں کہ صورت کو لے کر بیٹھے ہیں؟ یہ معترض نادان نہیں جانتے کہ صورت محضہ نہیں ہے اس میں بھی روح ہے گو ادنیٰ درجہ کی سہی پس جس وقت نماز کی نیت باندھی وہی نیت نماز کی روح ہے چنانچہ اگر نیت نہ ہو تو روزہ صحیح نہ ہو خواہ دن بھر نہ کچھ کھائے نہ پئے روزہ کی شرط نیت ہے۔ اور نیت فعل القلب ہے جب نیت کی بس روح متحقق ہو گئی۔ معترض نے ہماری نماز و زکوٰۃ کو "پوست بے مغز" سے تشبیہ دی لیکن وہ غلط ہے اس کی تشبیہ ہے "پوست با مغز کم روغن مغز کم روغن ہے"، سوکھا روکھا ہے مگر ہے ضرور! ایسا ہے کہ جتنا روغن اچھے مغز سے ایک

سیر میں نکلتا ہے یہاں چار سیر میں نکلے گا پس ان کے یہاں ''روح بلا صورت ہے اور ہمارے ہاں ''صورت مع الروح الضعیفہ''۔

اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جن کو دعویٰ نری روح کا ہے ان کے یہاں روح ہی نہیں، وہ لوگ بلا نماز کے جس کو روح سمجھتے ہیں وہ روح نماز ہی نہیں۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔ تحقیق اس کی یہ ہے کہ بعض ارواح کے تحقق کے بعض شرائط ہوتے ہیں۔ قاعدہ عقلیہ ہے کہ بلا شرط کے مشروط نہیں پایا جاتا۔ نماز کی جو روح ہے یعنی توجہ الی اللہ نصوص قطعیہ سے ثابت ہے کہ بدون نماز کی صورت کے نماز کی اس روح کا تحقیق ہی نہیں ہوتا یعنی جب نماز میں توجہ الی اللہ فرض کی گئی تو اس سے ثابت ہوا کہ مطلق توجہ الی اللہ نماز کی روح نہیں مثل روح انسانی کے فیضان کیلئے بدن انسانی کا شرط ہونا معلوم ہے تو گر کوئی گائے سامنے آجائے اور کہا جائے کہ اس کے اندر روح امانی ہے تو اس کی کبھی کوئی تصدیق نہ کرے گا کیونکہ عادۃً اللہ یونہی اری ہے کہ روح انسانی کا جب تحقق ہوگا اسی قلب انسانی میں ہوگا پس معلوم ہوا کہ نماز کی روح نماز سے مجرد ہو کر کبھی پائی نہیں جاتی جب قالب نہیں تو روح جس کا دعویٰ ہے وہ نماز کی روح ہی نہیں کسی اور چیز کی روح ہوگی چاہے روح نماز کے مشابہ ہو۔

اب ایک اور ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جس طرح وہ نماز کی روح نہیں اسی طرح کسی دوسری چیز کی بھی روح نہیں۔ پس کسی قسم کی روح نہیں۔ اس کی تقریر یہ ہے کہ نماز کی روح ''اللہ کی یاد'' ذکر اللہ یا خلوص مثلاً عبادت کی روح محبت یا عشق، یہ سب جب پایا جائے گا کسی نہ کسی شخص کے ساتھ پایا جائے گا کیونکہ مطلق من حیث ہو، مطلق نہیں پایا جا سکتا کلی مرتبہ کلی میں کبھی نہیں پائی جا سکتی، جس طرح کہ انسان جب کبھی پایا جائے گا کسی نہ کسی شخص کے ضمن میں پایا جائے گا اب ہم دیکھتے ہیں کہ روح یعنی ''توجہ الی اللہ'' کے جو افراد مطلوب ہیں وہ اس شخص کے ساتھ تو مطلوب نہیں جو بلا واسطہ کسی عمل ظاہری کے ہو کیونکہ اس میں کوئی مشقت و کلفت و مجاہدہ ہی نہیں بلکہ مطلوب خاص وہ افراد ہیں جو ضمن میں کسی عمل ظاہری کے ہوں پس وہ

توجہ الی اللہ ہی نہ پائی گئی پس ہم کہتے ہیں کہ کوئی روح ہی پائی نہیں گئی نہ نماز کی نہ غیر نماز کی اور اگر کوئی عمل ظاہر کیا ہے تو صورت کی حاجت ہوئی تو اے مدعی! وہی صورت کیوں نہیں قبول کرتا جو محبوب نے تجویز کی، ہم تو تیری نفی صورت کو جب جانتے جب تو تیری روح کو لا کر کھڑا کر دیتا۔ جب صورت سے چارہ نہیں تو صورتِ مجوزۂ محبوب سے اچھی کون سی صورت ہوگی۔" (وعظ "روح الارواح")

اسی وعظ میں یوں بھی فرمایا: "دراصل بڑا وہ ہے جو متبع شریعت ہے، کیونکہ ولایت شعبہ ہے نبوت کا، جتنا کوئی نبی کا مشابہ ہوگا اتنا ہی وہ بڑا ہوگا۔"

شیخ رہبر ہے نہ کہ جنت کا ٹھیکہ دار

کسی شیخ سے تعلقِ ارادت اور اس کے ہاتھ پر بیعت مقصود بن گئی تھی لوگ مرید ہو کر پھر مطمئن رہتے تھے کہ بس شیخ جنت میں لے جائے گا اپنے اعمال و اخلاق کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی فکر نہ ہوتی تھی حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس غلط فہمی کو پوری طرح رفع کیا اور خوب کھول کر بتایا کہ شیخ جنت کا ٹھیکیدار نہیں کہ بس اس کے ہاتھ پر ہاتھ دھرتے ہی جنت میں نشست محفوظ ہو جائے بلکہ وہ رہبری کا ایک ذریعہ ہے چلنا اور راستہ طے کر کے منزل مقصود تک پہنچنے کی سعی کرنا یہ خود مرید کا کام ہے چنانچہ فرمایا:

"بعضے سمجھتے ہیں کہ پیر بخشش کے ذمہ دار ہو جائیں گے حالانکہ جب خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تک کو فرمایا کہ فاطمہ اپنے کو دوزخ سے بچاؤ تو بھلا کون پیر کسی مرید کو بچا سکتا ہے۔ جب تک خود مرید ہی اس کی کوشش نہ کرے۔ بعض چاہتے ہیں کہ پیر صاحب ایک نظر میں کامل کر دیں اگر اس طرح کام بن جائے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو کچھ بھی نہ کرنا پڑتا کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کون کامل النظر ہوگا کہیں بطور خرق عادت ایسا ہو بھی گیا تو خوارق میں دوام ولزم نہیں اس بھروسہ پر رہنا بڑی غلطی ہے!"

یہی وجہ تھی کہ جب تک آپ کسی شخص کے اندر راہ حق پر چلنے کا جذبہ نہ پاتے تھے اور کچھ امتحان لے کر آزمانہ لیتے تھے، اس کو بیعت نہ فرماتے تھے بلکہ اگر اس میں

ضروریات دین کا صحیح شعور اور دینداری کا حقیقی تصور اور شریعت مطہرہ کا پورہ احترام نہ پاتے تو برسوں تک بیعت سے انکار فرماتے رہتے تھے۔ اس احتیاط کے باوجود اپنا تجربہ یہ بتاتے تھے کہ "اس قدر ٹھوک بجا کر لینے کے باوجود پھر بھی کوئی کھوٹا نکل ہی آتا ہے۔"

بیعت کے اصول

آپ پہلے مندرجہ ذیل شرائط پر بلا بیعت تربیت کی ذمہ داری لیتے تھے:

(۱) قرآن مجید جتنا پڑھا ہے یا جتنا یاد ہے کسی صحیح پڑھنے والے سے صحیح کرانا ہوگا۔

(۲) بہشتی زیور کے سب حصے یا سات حصے اور بہشتی گوہر اور اصلاح الرسوم اور قصد السبیل پڑھ کر یا سن کر اس کی پابندی کرنا ہوگی۔

(۳) میرے چھپے ہوئے وعظ ہمیشہ پڑھنا یا سننا پڑیں گے۔

(۴) ابتدائی تعلیم میرے کسی اجازت یافتہ سے (جس کو میں تحریر کروں یا طالب کی تجویز پر اجازت دوں) حاصل کرنا ہوگی اور جب تک پچیس بار ان سے خط و کتابت نہ ہو چکے براہ راست مجھے تعلیم کی استدعا نہ کی جائے۔"

ان شرائط پر جو شخص بھی پورا اترتا تو پھر اس کو بیعت فرما لیتے تھے۔ آپ کے حلقۂ ارادت میں وہ لوگ نہ آسکتے تھے جن سے آپ کے قلب میں کسی قسم کا حجاب ہو خواہ اس کی وجہ اختلاف طبائع ہو یا اختلاف مسلک یا دنیوی وجاہت وغیرہ ورنہ غیر متشدد اور غیر متعصب غیر مقلدین کو بھی داخل سلسلہ فرما لیتے تھے۔

مستورات کو بیعت کرنے میں زیادہ تنگی نہ فرماتے تھے لیکن شرط یہ تھی کہ وہ اپنے شوہر یا شوہر نہ ہونے کی صورت میں کسی محرم سرپرست کی صریح اجازت حاصل کر کے پیش کریں اس کے بعد پردے کے پورے اہتمام کے ساتھ بیعت فرما لیتے تھے، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ بیعت کے وقت عورت کے کسی محرم کو ضرور پاس رکھتے یا پھر اپنی اہلیہ یا کسی محرم بی بی کو اپنے پاس رکھتے اور جب نیکیوں کے کرنے اور برائیوں سے بچنے کا عہد لیتے تو تاکید فرماتے:

''میں جو کچھ کہتا جاؤں تم بھی چپکے چپکے کہتی جاؤ پکار کر نہ کہو''

حالت سفر میں بجز عورتوں یا ایسے افراد جن سے مناسبت پیدا ہو چکی ہو، کسی کو بیعت نہ فرماتے تھے اور اس میں مصلحت یہ تھی کہ لوگ دوکانداری اور سفری پیروں سے احتیاط کرنا سیکھیں۔

ایسے حضرات جو کسی صحیح سلسلہ سے متعلق ہوں اور اپنے شیخ کی وفات پر آپ سے مکرر بیعت کے طلب گار ہوں ان سے یہ فرماتے: ''پچھلی بیعت مع اپنی ساری برکات کے بدستور قائم ہے، تجدید بیعت کی حاجت نہیں البتہ تعلیم طریق کے لئے حاضر ہوں'' البتہ جب زیادہ اصرار پاتے اور طالب کی تسلی و تشفی اسی میں پاتے تو کبھی کبھی بیعت بھی فرما لیتے تھے ہاں جس کا سلسلہ صحیح نہ ہوتا اور کسی فاسق کا مرید ہوتا تو اس کو ضرور بیعت فرما لیتے لیکن پچھلے شیخ کی شان میں گستاخی سے پھر بھی منع فرماتے کہ یہ راہ سراسر ادب ہی ادب کی ہے۔ ع

بے ادب محروم ماند از لطف رب!

شیخ مرید کا تابع نہیں ہوتا

تعلیم و تربیت میں آپ کبھی مرید کے تابع نہ ہوتے تھے بلکہ ہمیشہ اس کو اپنا تابع رکھتے تھے ہاں اس کے جذباتِ صحیح کی ہر طرح رعایت فرماتے تھے۔

آپ کو چونکہ فاروقیت سے حصہ وافر ملا تھا اس لئے طالب کی ادنیٰ بدتمیزی پر اس کے خفیہ سے خفیہ کید پر سخت گرفت فرماتے تھے اور ایسی جرح کرتے تھے کہ خود وہ اپنے آپ اپنی کوتاہیوں کا معترف ہو کر آئندہ کے لئے اپنے مکائد نفس سے باخبر ہو جاتا تھا، جو مریدین محض فقہی سوالات پوچھتے تھے ان کو یہ مشورہ دیا جاتا تھا کہ ''یہ مسائل کہیں اور پوچھیں'' اس میں مصلحت یہ تھی کہ اس سے مرید کی توجہ اپنے نقائص سے ہٹ کر صرف مسئلہ مسائل میں صرف ہوتی ہے جس سے مقصد بیعت فوت ہوتا ہے۔

اتباع شیخ کا درجہ

اتباعِ شیخ اصلاحِ باطن کی کنجی ہے، لیکن اس اتباع کے بھی حدود متعین ہیں، لیکن خود صوفیائے کرام ہی کے بعض ارشادات سے بعض لوگ غلط فہمی میں پڑ گئے اور دوکانداروں کو تو حدود شریعت کے مسمار کرنے کا ایک تیشہ ہاتھ آیا، ان کو جب کسی نے ٹوکا کہ حرم شریعت کو ڈھا کر پھر اسلام کہاں باقی رہے گا تو فوراً فاخرانہ انداز میں کہہ اٹھے کہ میاں یہ طریقت ہے اور اس کا دستور یہ ہے کہ ۔

بہ مئے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسمِ منزلہا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پردہ کو چاک کر دیا اور اتباعِ شیخ کی حقیقت یوں بیان فرمائی: ''الاعتدال فی متابعة الرجال''

یہ اتباع نہ عقاید میں ہے نہ کشفیات میں، نہ جمیع مسائل میں، نہ امور معاشیہ میں، صرف طریق تربیت و تشخیص امراض و تجویز تدابیر اور ان مسائل میں ہے جن کا تعلق اصلاحِ تربیت باطنی سے ہے۔ وہ بھی اس وقت تک جب تک کہ ان کا جواز مرید و شیخ کے درمیان متفق علیہ ہو، اور اگر اختلاف ہو تو شیخ سے مناظرہ کرنا خلافِ طریق ہے اور امتثال امر خلافِ شریعت ہے، ایسی صورت میں ادب جامع بین الادبین یہ ہے کہ علماء سے استفتاء کر کے یا اپنی تحقیق سے حکم متعین کر کے شیخ کو اطلاع کرے کہ میں فلاں عمل کو جائز نہیں سمجھتا اور ہمارے سلسلہ میں اس کی تعلیم ہے مجھ کو کیا کرنا چاہئے، اس پر اگر شیخ پھر بھی وہی حکم دے تو اس شیخ کو چھوڑ دینا چاہئے اور اگر وہ ترک کی اجازت دے تو یہ بھی اس کی متابعت ہے، یہ معنی ہیں ''اتباع کامل'' کے یعنی جو مرض نفسانی اس نے تجویز کیا ہو یا جو تدبیر اس نے تجویز کی ہو یا جو عمل مشروع جس کا مشروع ہونا شیخ و مرید میں متفق علیہ ہو، تجویز کیا ہو، ان چیزوں میں اتباع کامل کرے، ذرا بھی اپنی رائے کو دخل نہ دے اور باقی امور میں اتباع مراد نہیں۔'' (حکیم الامت نقوش و تاثرات ص ۳۰۹)

اجازتِ شیخ کا درجہ

یہ غلط فہمی بھی عام ہے کہ کوئی بزرگ جب کسی کو اپنا خلیفہ بناتا ہے اور اس کو اجازت بیعت دیتا ہے تو اس سے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ مجاز، شیخ کا ہر طرح قائم مقام اور کامل ہے اس خیال کی تردید مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی جس سے ایک طرف عوام کی غلط فہمی دور ہوگئی اور دوسری طرف خود خلفاء و مجاہدین کو اپنے "کچھ ہونے" کے خیال سے نکال کر اور زیادہ جدوجہد کی طرف راغب کر دیا:

اجازت دلیل کمال نیست، بلکہ دلیل مناسب است

چنانچہ دستارِ فضیلت بعد فراغ کتب می بندند اگرچہ عالم کامل نہ باشد۔ صرف مناسبت مدار ایں رسم باشد کمال بفراغ دوراست۔"

ہر شیخ ولی نہیں ہوتا

اسی طرح عام طور پر لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مرشد ولی ہوتا ہے اور کسی کو خلافت ملنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اسکو ولایت بھی مل گئی، حالانکہ یہ ایک کھلی بات ہے کہ خلافت تو ایک انسان عطا کرتا ہے اور ولایت محض عطیۂ ربانی ہے ایک سے دوسری کا کیا تعلق لیکن بہرحال ایک غلط فہمی عام ہوچکی تھی اسلئے مرشد تھانوی نے اس کی بھی اصلاح فرمادی اور سمجھایا:

"بعضے خاص لوگوں کو بھی شیخ اور ولی کا فرق معلوم نہیں ولی کہتے ہیں مقبول کو اگرچہ لٹھ اور جاہل ہو۔ اور شیخ کہتے ہیں فن دان کو اگرچہ وہ فاسق و فاجر ہو، ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ اگر شیخ متقی ہوگا تو اس کی تعلیم میں برکت ہوگی اگر متقی نہ ہوگا برکت نہ ہوگی لیکن چونکہ اکثر لوگوں کو اس کے معنی معلوم نہیں اس لئے شیخ کا ولی ہونا لوازم سے سمجھتے ہیں سو یہ غلطی ہے۔" (الافاضات الیومیہ حصہ پنجم ص ۴۲۸)

اس مربی کامل نے طالب کے لئے چار باتیں ضروری و لازمی بتائی ہیں:

طالب کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں

"طالب کے لئے چار چیزوں کی ضرورت ہے دو بیعت سے پہلے اور دو بیعت کے

بعد ہمیشہ تک، پہلی دو چیزیں اعتقاد[1] واعتماد[2] اگر شیخ پر اعتقاد نہ ہوگا تو فائدہ نہیں ہوگا اعتقاد یہ ہونا چاہئے کہ اسکی تعلیم و تربیت میرے لئے سب سے انفع ہے دوسرے اعتماد ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ اعتماد نہ ہوگا تو اس کی تعلیم و مشورہ میں خلجان رہے گا اب دوسری دو جن کی ضرورت بیعت کے بعد ہے وہ ہیں اطلاع[3] اور اتباع[4]۔ کیونکہ بدوں اطلاع کے شیخ طالب کے لئے کوئی تجویز یا ترمیم کیسے کرے گا۔ اس لئے کہ ہر شیخ کا صاحب کشف ہونا اور صاحبِ کشف کے لئے ہر وقت کشف کا ہونا ضروری نہیں کہ بغیر اطلاع کے اس کو خبر ہو جایا کرے پھر اطلاع کے بعد اتباع ہے کہ جو کچھ شیخ نے بتایا ہے بس اس میں کمی بیشی نہ کرے اور اپنی رائے سے کچھ نہ کرے اور اگر امر شیخ کے اتباع میں دشواری ہو یا مشقت ہو یا ضرر دیکھے تو اس کی بھی شیخ کو اطلاع کرے وہ کوئی مناسب تجویز کرے گا۔ (مقالات حکمت)

نصف سلوک

آپ کی مربیانہ شان اس سے عیاں ہے کہ آپ کے بعض دو لفظی یا سہ لفظی جملے ایسے ہیں جو حکمت و معرفت کے دفتر اپنے اندر رکھتے ہیں اور جن کو پیش نظر رکھ کر راہ سلوک کی بیشتر گرہیں کھولی جاسکتی ہیں مثلاً فرمایا اور بکثرت فرمایا ہے:

"نصف سلوک یہ ہے کہ غیر اختیاری امور کے درپئے نہ ہوں اور اختیاری امور میں کوتاہی نہ کریں۔"

یعنی اگر کوئی امر اختیاری ہے (مثلاً نماز، روزہ، ذکر شغل وغیرہ) تو اس میں ہمت اور عزیمت سے کام لے خواہ اس سے دل بستگی ہو یا نہ ہو۔ اور خواہ اس میں دل جمعی رہے یا نہ رہے البتہ جو امور بندے کے اختیار سے باہر ہیں اور محض حق تعالیٰ کی دین ہیں (مثلاً یکسوئی، سرور یا رقت اچھے اچھے خواب یا انوار و تجلیات وغیرہ) ان کے پیچھے نہ پڑے۔ اور اس میں نکتہ یہ ہے کہ یہ سب غیر اللہ ہیں اور جب بندہ ان کا طالب ہوتا ہے تو اللہ کا طالب کہاں رہا اسی لئے شیخ الشیوخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا:

"طالبِ لذت طالبِ حق نہیں"

اسی طرح اعمال کے ترک واختیار سے متعلق دو لفظ فرمائے جو لوحِ ذہن پر نقش ہونے چاہئیں یعنی ہر عمل سے پہلے یہ سوچ لے کہ یہ "مقصود ہے یا غیر مقصود"۔ اگر وہ مقصود ہے تو بہر نوع اس کو اختیار کرے اور اگر غیر مقصود ہے تو بہر حال اس کو ترک کرے ہاں جو اعمالِ مقصود میں معاون ہوں ان کا اختیار بھی بہ اعتبار حالت وضرورت ضروری ہوسکتا ہے اور یہ شیخ کے مشورہ سے ہونا چاہئے:

اسی طرح فرمایا:

"مجاہدہ کا اجر مشاہدہ سے زائد ہے" (نقوش وتاثرات ص۳۷۲)

مجاہد کا درجہ راہب وزاہد کا فرق

بعض لوگ ذکر وشغل اور دیگر مجاہدات ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی یاد کو دائم کرنے اور اس کو قلب میں رچانے بسانے کے ذرائع ہیں ان کو بالذات مقصود سمجھنا تعلیمات اسلامی کے مغائر ہے شیخ تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"مجاہدہ معالجہ ہے وہ مقصود بالذات نہیں، اس کو مقصود بالذات سمجھنا یہ رہبانیت ہے پس راہب وہ ہے جو ان معالجات کو قربات سمجھے باقی جو معالجہ کو معالجہ سمجھے وہ راہب نہیں زاہد ہے۔" (فیض الخالق)

کیفیت واحوال کا درجہ

حکیم الامت طبیب حاذق تھے اس لئے طالبین کی توجہ کو ہمیشہ کیفیت واحوال کی طرف سے ہٹاتے رہتے اور اصل مقصود یعنی "رضائے حق" کی طلب میں منہمک رکھتے تھے، ارشاد ہے:

"اسرار وذوقیات کے نعمت ہونے میں شک نہیں، اگر بدون طلب کے حاصل ہوجائیں تو شکر کرنا چاہئے مگر چونکہ مقصود ومطلوب نہیں ہیں، اس لئے ان کے درپے نہ ہونا چاہئے، حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ کا ارشاد ہے کہ ذوق وشوق

وانس وغیرہ ''حجابات نورانیہ'' ہیں اور حجابات نورانیہ ''حجابات ظلمانیہ'' سے اشد ہیں کیونکہ حجابات ظلمانیہ کی طرف سالک متوجہ نہیں ہوتا ان کو خود دفع کرنا چاہتا ہے۔ اور حجابات نورانیہ کی طرف متوجہ ہوتا اور التفات کرنے لگتا ہے جس کی وجہ سے توجہ ''مقصود اصلی'' سے ہٹ جاتی ہے۔''

شیخ شیراز (سعدی علیہ الرحمہ) نے بھی اس حقیقت کو خوب واشگاف کیا ہے اور تنبیہ فرمادی ہے۔

خیالات نادان خلوت نشین
بہم بر زند عاقبت کفر و دین

اصل شے حبِ شیخ واتباعِ سنت ہے

عارف کامل شیخ مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے اس قول کو حکیم الامت اکثر نقل فرماتے اور اس پر بہت زور دیتے تھے کہ:

حب [1] شیخ اور اتباع سنت [2] کے ہوتے ہوئے اگر لاکھ ظلمات بھی ہوں تو وہ سب ''انوار'' ہیں اور اگر ان میں ایک چیز کی بھی کمی ہوئی تو پھر سارے انوار ظلمات ہی ہیں۔

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست
بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

اس طریق کا اول قدم فنا ہے

صوفیائے کرام کے دو گروہ ہیں ایک کے نزدیک ''فنا'' ابتدا ہے دوسرے کے نزدیک انتہا ہے حکیم الامت نے اس اختلاف کی حقیقت یوں ظاہر فرمائی:

''اس طریق کا اول قدم ''فنا'' ہے جس میں یہ صفت نہ پیدا ہوئی بس سمجھ لو کہ اس کو طریق کی ہوا بھی نہ لگی اور یہ جو بزرگوں کا قول ہے کہ طریق کا آخر قدم فنا ہے وہ بھی بالکل صحیح ہے اور اس سے مراد ''کمالِ فنا'' ہے۔ کیونکہ فنا کے بھی تو آخر درجات ہیں۔''

شیخ کی نظر ملکات پر ہونی چاہئے نہ کہ افعال پر

حکیم الامت کی شانِ تربیت کا باب اس قدر وسیع ہے کہ ع

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

اس لئے آخر میں اب ایک ارشاد درج کر کے اس عنوان کو ختم کیا جاتا ہے کوئی ماہر نفسیات یا شیخ کامل ہی اس کو سمجھ کر اندازہ لگا سکتا ہے کہ آپ امراضِ روحانی کے کس قدر ماہر فن دان اور حاذق طبیب تھے، فرماتے ہیں:

> ''میری نظر'' ''ملکات'' پر ہوتی ہے۔ ''افعال'' پر نہیں ہوتی کیونکہ افعال تو ''ارادہ'' بدلنے پر ایک منٹ میں درست ہو سکتے ہیں لیکن ملکات کی اصلاح ہونا برسوں میں بھی مشکل ہے۔

اور یہ تو آپ کے ماہر نفسیات اور شیخ کامل ہونے کی چند مثالیں ہیں ورنہ ''تربیت السالک'' اٹھا کر نفسیاتی نقطہ نظر سے کوئی دیکھ لے تو اس کو اس زائد از ہزار صفحات کتاب کا ہر ہر صفحہ فنی نکات سے پر دکھائی دے گا اور جو کوئی ''دیدہ ور'' ہو تو اس کو ہر جملے سے درس معرفت ملے گا۔

سچ تو یہ ہے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ قدس سرہٗ جیسی ہستی کو ماہر نفسیات و فلسفہ کہتے ہوئے بھی شرم سی آتی ہے کیونکہ یہ تو ان گنی چنی ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کے اقوال وملفوظات سے علم فلسفہ ونفسیات کے اصول مرتب ہو سکتے ہیں۔

تربیت یافتگانِ اشرفیہ

کسی درسگاہ کی تعلیم و تربیت کا صحیح اندازہ وہاں کے فارغ شدہ طلبہ کی علمی استعداد اور عملی صلاحیت ہی سے ہوسکتا ہے صدفی صد تو نہیں مگر جس ادارہ کی اکثریت اچھی ہوگی وہ ادارہ لائق اعتماد سمجھا جائے گا ورنہ اس کی ساکھ جاتی رہے گی۔ ''تربیت گاہ اشرفیہ'' کی وقعت وعظمت کے ثبوت میں اس نوع کی دلیل بھی بے کھٹکے پیش کی جاسکتی ہے۔

اشرفی درسگاہ میں صدیوں کے بھلائے ہوئے سبق اصلاح معاملات ومعاشرات پر اس قدر زور دیا جاتا تھا کہ بغیر اس کے ذکر وشغل کی اجازت ہی نہ ملتی تھی اور جب مل جاتی تھی تب بھی اس کے بدون اس پر اکتفا نہ کیا جاتا تھا، حیرت ہے کہ سیرت نبوی ﷺ کا پہلا درخشاں پہلو جو اثبات نبوت کے لئے ایک کھلی دلیل ہے جس کے ہوتے ہوئے کافروں نے چاہے جتنی افترا پردازیاں کی ہوں لیکن ''امانت'' و ''دیانت'' اور ''صفائی معاملات'' کا آخر وقت تک بھی انکار ممکن نہ ہوا بلکہ قولی انکار تو کیا ہوتا ''عملی انکار'' بھی نہ ہوسکا۔ اس کو تصوف سے صوفیائے سوق نے اس طرح الگ کر دیا گویا اسکی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ حالانکہ ہر عاقل جانتا ہے کہ درسگاہِ محمدیہ ﷺ کے فارغین کرام ﷺ نہ ہوا پر اڑے ہیں، نہ پانی پر چلے ہیں، نہ انہوں نے بلا مشقت کسی دستِ غیب کے ذریعہ اپنا پیٹ پالا ہے نہ انہوں نے ''تصرفات'' سے کسی کو زیر کیا ہے، اور نہ محض ''تیغ وتفنگ'' کے ذریعہ اپنی ساکھ جمائی ہے، مگر ہاں ان کا جو وصفِ امتیازی ہے وہ یہی کہ وہ بات کے پکے تھے۔ وعدے کے سچے تھے، حق کے معاملہ میں نہ تحریص ان کے قدم ڈگمگا سکتی تھی نہ تخویف سے وہ لرزہ براندام ہوتے تھے اپنوں اور پرائیوں پر شفقت ان کا خاص شعار تھا ان کا پڑوسی، ان کی رعایا، ان کے خدام اور ان کے ماتحت ان سے ایسے خوش تھے کہ اس

سر پرستی کو بدل و جاں اپنے لئے باعث رحمت سمجھتے تھے وہ انفرادی حیثیت میں اور اجتماعی موقف میں، گھر کی چہار دیواری اور ملک کی وسعتوں میں ہر اعتبار سے لائق اعتماد اور قابل تقلید تھے۔ اور یہی ان کی دنیوی کامرانی اور اخروی نجات کا سہارا تھا۔

حکیم الامت کا یہ کارنامہ بھی آپ کی ''تجدیدی شان'' کا ایک کھلا ثبوت ہے کہ آپ نے اس اہم پہلو کو جس کے بغیر انفرادی و اجتماعی صلاح و فلاح کا تصور ناممکن ہے، پوری طرح اجاگر کیا اور اس کو تربیت باطنی کا جز و لاینفک قرار دیا یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کے تربیت یافتوں اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والوں میں اس کا اہتمام اس درجہ نمایاں ہے کہ اب ''مدعیانِ تہذیب و اخلاق'' کو بھی انگشت نمائی کی گنجائش نہیں رہی ہے بلکہ اس دور میں جب کہ اور مقامات پر سیرت سازی کے اس پہلو سے تغافل ہے مسلک اشرفیہ کے پیرو کی کسوٹی ہی یہ بن گئی ہے کہ اس کو ''معاملات'' کی بھٹی میں ڈال کر آزمایا جائے جو پورا پورا نکھر آئے وہ ''اشرفی'' ہے اور جو اس میں جل جائے وہ کھوٹ! چاہے وہ پھر اپنی تائید میں کتنے ہی اسناد پیش کرے۔

اختصار کے مدنظر ذیل میں چند واقعات صرف ایسے افراد کے درج ہیں جو نہ صرف یہ کہ مولوی ہی نہیں تھے بلکہ عام کتابی علم سے بھی نا آشنا تھے اور اس کے باوجود ایسے محتاط تھے کہ اور جگہ کے صاحب علم حضرات بھی کم ہی اس درجہ پابند ہوں گے۔

(۱) الہ آباد کے ایک نائی تھے حضرت سے مرید ہوئے تو اپنا پیشہ محض اس وجہ سے چھوڑ دیا کہ اس میں اکثر مسلمانوں کی ڈاڑھیاں مونڈنی پڑتی تھیں انہوں نے پکوان سیکھا اور اس کو اپنا ذریعہ معاش بنایا اور اپنی دیانت داری کی وجہ سے اس درجہ مقبول ہوئے کہ آمدنی بھی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی اور ہر وقت عمدہ عمدہ غذائیں نصیب میں آئیں۔

(۲) فتحپور کے ایک معمار آپ کے مرید ہوئے تو اس کی بڑی احتیاط ہوگئی کہ امانی میں بھی ویسی ہی تیز دستی سے کام کرنا چاہئے جیسا کہ ٹھیکہ میں کیا جاتا ہے اپنی اس صفت کی وجہ سے وہ وہاں کے صاحب علم حضرات کے لئے بھی باعث رشک ہوگئے اور سب کی

نظروں میں لایق عزت ٹھہرے۔

(۳) حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم کا قیام مدرسہ دیو بند میں ایک صاحب کے ہاں ہوا جب رات ہوئی اور لالٹین آئی تو خادم نے پوچھا کہ آیا یہ مدرسہ کا تو نہیں ہے؟ بس اس سوال پر ایک معمر بزرگ نے ان سے پوچھا، کیا تم کو مولانا تھانوی سے تعلق ہے؟

(۴) اسی طرح ایک طالب علم کسی مسجد میں مسجد ہی کے چراغ سے مطالعہ کر رہے تھے۔ جب چراغ گل کرنے کا وقت آیا تو فوراً اس کو گل کر کے اپنا چراغ جلایا ایک اجنبی عالم نے اس حرکت کو دیکھ کر وہاں کے لوگوں سے کہا: ''معلوم ہوتا ہے اس کو مولانا تھانوی سے تعلق ہے'' چنانچہ تحقیق پر یہ بات سچ نکلی۔

(۵) یہ حال جب غیر پڑھے لکھوں کا ہو گیا تو جو تعلیم یافتہ تھے ان کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے بی۔ اے اور ایل ایل بی کی سند علی گڑھ سے حاصل کی اور وکالت کو ذریعہ معاش قرار دیا مگر حکیم الامت کے تعلق نے کچھ ہی عرصہ میں اس پیشہ سے موصوف کو متنفر کر دیا اور کسبِ طیب کے خیال سے ہومیو پیتھی کی تعلیم حاصل کی اور بحمداللہ کہ ۳۰ برس سے ایک کامیاب ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

(۶) ایک واقعہ اس تربیت گاہ کے ایک اور قدیم تربیت یافتہ حضرت خواجہ عزیزالحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی سنئے۔ ایک دفعہ سفر پر جا رہے تھے اسٹیشن پہنچ کر اسٹیشن ماسٹر سے خواہش کی کہ سامان تلوا کر اس کا محصول بتائے؟ اسٹیشن ماسٹر نے تساہل کی بنا پر انکار کیا۔ خواجہ صاحب مصر ہوئے اسے کیا خبر کہ یہ بھی کوئی بی اے، ایل ایل بی (علیگ) ہیں اس گمان سے کہ ملا آدمی ہیں کچھ تحکمانہ انداز سے زور دیا کہ بلا اسباب تلوائے چلے جائیں خواجہ صاحب کو غصہ آ گیا اور انگریزی زبان میں اس کو خوب لتاڑا کہ کمپنی نے تم کو معافی کا حق کب دیا تھا؟ اور فرمایا کہ ابھی بددیانتی کی رپورٹ کئے دیتا ہوں! اس پر وہ بڑا پریشان ہوا لجاجت سے معافی چاہی اور فوراً سامان تلوا کر حسب ضابطہ محصول وصول کیا۔ اس نے اصول کا ایسا پابند شاید پہلا ہی انسان دیکھا ہوگا!

مریدوں میں یہ اثر نہ صرف حضرت شیخ کی نگرانی وتربیت کا نتیجہ تھا بلکہ خود آپ کے عملِ مستحکم کا باعث بھی تھا۔ جس کے کئی واقعات گذر چکے، اور جو لکھے جا چکے ہیں وہ کل کا ایک ادنیٰ جزو بھی نہیں۔ یہاں موقع کی مناسبت سے ایک اور واقعہ درج ہے جس میں ہر مسلمان کے لئے عبرت ہی عبرت ہے۔

ایک عبرت آموز واقعہ

ایک مرتبہ آپ سہارنپور سے تشریف لے جارہے تھے، کچھ گنے ساتھ تھے آپ نے ضابطہ کے تحت ان کو تلوانا چاہا تو اسٹیشن کے غیر مسلم ملازمین نے ازراہِ عقیدت عرض کی ''آپ یونہی لے جائیں تلوانے کی ضرورت نہیں ہم گارڈ سے کہہ دیں گے۔'' آپ نے فرمایا یہ گارڈ کہاں تک جائے گا۔'' انہوں نے عرض کیا ''غازی آباد تک'' ارشاد ہوا ''غازی آباد سے آگے کیا ہوگا؟ عرض کی ''یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے کہدے گا''، آپ نے پھر سوال کیا۔ پھر آگے کیا ہوگا'' جواب ملا وہ کانپور تک پہنچادے گا اور وہاں آپ کا سفر ختم ہوگا۔'' اس پر مجدد ملت نے فرمایا ''نہیں وہاں سفر ختم نہیں ہوگا بلکہ آگے ایک اور سفر آخرت کا بھی ہے وہاں کا کیا کیا انتظام ہوگا؟''

بس یہ سن کر سب دنگ رہ گئے کہ ایسے بھی محتاط بندے ہوتے ہیں جو خدائے تعالیٰ سے اس قدر ڈرتے ہیں اور اپنے ہر عمل میں مسئولیت کے تصور کو اس درجہ متحضر رکھتے ہیں!!

حکیم الامت کے اس عمل وتلقین اور مریدوں میں اس کے اہتمام کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کوئی شخص تھانہ بھون اسٹیشن پر اترتا تھا تو اس سے ریلوے والے پوچھتے تک نہیں تھے کہ سامان تلوایا بھی یا نہیں؟ اور اس کا محصول ادا کیا بھی یا نہیں؟ سب یہی کہتے تھے کہ یہ تھانہ بھون والے مولانا صاحب کے پاس جارہے ہیں اور وہاں جانے والے بلا اسباب تلوائے سفر نہیں کرتے۔ غیر اقوام پر مسلمانوں کی ساکھ اسی طرح قائم ہوتی ہے۔ اور اسی

صفائی معاملات کے ذریعہ قائم رہ سکتی ہے، مگر شب و روز نے ہزاروں کروٹیں بدلی ہوں گی کہ نادانوں اور نفس پرستوں نے اس اہم باب کو "کتاب تصوف سے" یکسر محو کر دیا تھا۔ حکیم الامت نے پھر اس کو داخل نصاب کیا۔ اور اپنے شاگردوں پر اس پرچہ کو لازمی قرار دیا!!

یہ اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے کہ جہاں اور جگہ کے مریدوں میں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود لطائف اور الوان، سیر اور طیران وغیرہ کا چرچا پایا جائے گا حکیم الامت کے متعلقین میں اس کے برعکس حلال و حرام کی تمیز ادائی حقوق کا پاس صفائی معاملات کا لحاظ اور احتسابِ نفس کی گرم جوشی ملے گی!

حق تعالیٰ توفیق بخشے کہ آپ کے منتبین اور معتقدین اس امتیاز کو بہ ہر قیمت باقی رکھیں۔

کرامات

کرامات گویا بزرگی کا لازمہ بن گئی ہیں حالانکہ اگر یہ حقیقی ہوں تو بھی کسی کی اختیاری نہیں اور جب غیر اختیاری اور محض عطائی ہیں تو اس پر کسی کی بزرگی کا مدار کیوں ہو؟ بندہ اختیاری امور کا پابند ہے اور انہی امور کی پابندی اور تکمیل اس کے لئے وجہ بزرگی ہے۔
پھر اصطلاحی کرامات سے زیادہ ایک اور اہم بات ہے جو حضور انور ﷺ کے قول محکم سے ثابت ہے، وہ ہے فراست مومن اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله (مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے) یہ صفت غیر مومن سے میل نہیں کھاتی کیونکہ اس کی اصل ہے "نورِ الٰہی" جو اتباعِ سنت سے بڑھتا اور پیروئی نفس سے مٹتا ہے کفر کے ساتھ اس کا اتصال ناممکن۔

فَاِنَّ الْعِلْمَ نُوْرٌ مِّنَ اِلٰهٖ وَ نُوْرُ اللّٰهِ لَا يُعْطِي لِعَاصِيْ

(علم حق تعالیٰ کا نور ہے اور حق تعالیٰ کا نور کسی گنہگار کو عطا نہیں ہوتا) (امام شافعی)

لیکن اس نور ربانی کی جو انبیاء علیہم السلام کو بدرجہ اتم اور اولیائے کرام کو حسب مراتب حاصل ہوتا ہے، لوگوں کے ذہن سے اہمیت نکل گئی اور کشف و کرامات کے پیچھے پڑ گئے جس کی پہچان بھی مشکل ہے اور جو بہ اعتبار ظہور اہلِ کفر سے تک ممکن ہے ساتھ ہی یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ اگر آج کل کی اصطلاحی کرامات ہی بزرگی کا معیار ہیں تو جتنی کرامات آج کسی ادنیٰ ولی کی جانب اس کے معتقدین منسوب کرتے ہیں کیا اس کا عشر عشیر بھی صحابہ کرام کی سیرتوں میں ملتا ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر اس معیار کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے چنانچہ امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

ظہور خوارق نہ از ارکان ولایت است و نہ از شرائط آں و کثرت ظہور خوارق بر

افضلیت دلالت ندارد۔ تفاضل آنجا بہ اعتبارِ درجات قرب الٰہی است جل سلطانہ۔ تواند بود کہ از ولی اقرب ظہور خوارق اقل باشد ازاں بعد اکثر خوارقے کہ از بعضے اولیاء امت بظہور رسیدہ انداز اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین عشر عشیر آن بظہور نیامدہ بہ آنکہ افضل اولیائے است برمرتبہ ادنیٰ صحابی نمی رسد۔ وہم چنیں از اولیائے متقدمین ایں قدر خوارق نقل کردہ اند کہ از متاخرین۔ مثلاً جنید رحمۃ اللہ علیہ کہ سید ایں طائفہ است معلوم نیست کہ ازوے دہ خوارق نقل کردہ باشند۔ (مکتوبات)

پس معلوم ہوا کہ اصل کرامت و بزرگی اتباع سنت کی تکمیل اور اس پر استقامت ہے کیونکہ ولایت شعبہ ہے نبوت کا اور جو جتنا نبی ﷺ کے مشابہ ہوگا اتنا ہی بڑا ہوگا خواہ اس سے ایک خرق عادت بھی سرزد نہ ہو صوفیائے ربانی کا قول مشہور ہے ''الاستقامت فوق الکرامتہ'' (شریعت پر استقامت ساری کرامات سے افضل چیز ہے) انہی وجوہ سے حکیم الامت نے اپنی سوانح میں اس باب ہی کے حذف کرنے کا حکم دیا اور جو واقعی کرامات تھیں ان کو ''انعامات الہیہ'' کے غیر مبہم الفاظ سے تعبیر فرمایا۔ جس سے یہ بات کھل گئی کہ اس میں بندہ کے کسب کو دخل نہیں! بلکہ یہ خصوصی عنایات ہیں جو محبوب کی طرف سے محبّ پر ہو جاتی ہیں کہ دوسروں سے اس کا کیا تعلق چنانچہ بزرگانِ دین نے تو اپنے کشف و کرامات کو اس درجہ چھپایا ہے جیسے کوئی حائضہ اپنے حیض کو چھپاتی ہے[1] اور ان سے بچنے کی دعائیں مانگیں ہیں اور اس کی وجہ عارف باللہ حضرت عبدالعزیز دباغ قدس سرہٗ سے سنئے فرماتے ہیں:

''کشف کو لوگ پسند کرتے ہیں حالانکہ اس میں بڑی مضرت ہے خود ولی کے لئے بھی اور اس کے لئے بھی جو ولی سے اس کا طالب ہو۔ ولی کے لئے تو یہ ضرر ہے کہ اس میں مشاہدہ حق سے مشاہدۂ خلق کی طرف اترنا پڑتا ہے اور یہ بالا مقام سے پستی کی طرف

[1] بعض صوفیا کا قول ہے کرامات اولیاء اللہ کا حیض ہیں'' مطلب یہ نہیں کہ کرامات حیض کی طرح ارذل ہیں بلکہ یہ کہ حیض کی طرح وہ لائق اخفا ہیں اور ان کا اظہار اتنا ہی شرمناک ہے جتنا کہ حیض کا اظہار ایک حائضہ دوشیزہ کے لئے: (مؤلف)

انحطاط ہے اور طالب کا ضرر یہ ہے کہ کشف و کرامات کا طالب وہی ہوتا ہے جس کی محبت اوپری ہوتی ہے [1]

حکیم الامت کی کرامات

حکیم الامت کو "فراست مومن" سے حصہ وافر ملا تھا جو آپ کی بزرگی پر شاہد ہے اور جس کا اندازہ گزشتہ ابواب کے حقائق سے بخوبی ہوسکتا ہے آپ کی کرامات تو آپ کے "آثار علیہ" اور "نقوش عملیہ" ہی ہیں جن سے تجدید دین کا مہتم بالشان کام ظہور میں آیا۔ لیکن ساتھ ہی آپ کی بابرکت ذات سے بیسیوں نہیں سینکڑوں واقعات ایسے بھی ظاہر ہوئے جن کو عام طور پر کرامات کہا جاسکتا ہے اور جس کی صحیح اصطلاح "انعامات الٰہیہ" ہے ان میں سے صرف چند بحوائے مشتے از خروارے درج ذیل ہیں تا کہ جن کی تشفی "معنوی کرامات" سے نہ ہوتی ہو اسی سے مطمئن ہو جائیں۔

وقت میں برکت

آپ کے وقت میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت دی تھی جس کی بنا پر آپ تنہا وہ خالص علمی وفنی کام کر گئے جو اتنی مدت میں ایک متحدہ جماعت سے بھی مشکل ہی سے انجام پا سکتا ہے اس کی ایک صورت تو یہ ہوئی کہ آپ بہت کم بیمار ہوتے تھے اور اگر ہوتے بھی تو بہت جلد شفایاب ہو جاتے تھے دوسرے یہ کہ جس مضمون یا مسئلہ کی تلاش ہوتی غیب سے اس کے سامان مہیا ہو جاتے تھے مثلاً شرح مثنوی لکھتے وقت کبوتر بازوں کے ایک معمول کے معلوم کرنے کی ضرورت ہوئی۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ ایسے میں ایک کبوتر باز تعویز لینے آیا اور اس سے وہ بات معلوم ہوگئی ایسے ہی یہ بھی غیب سے انتظام ہوتا ہے کہ جس روز خطوط کی بھرمار ہوتی تو اس روز تعویز مانگنے والے یا تو آتے ہی نہیں یا بہت کم آتے تھے [2]

---

[1] دیکھو "تبریز" (ترجمہ ابریز) ص ۱۲۸ از مولانا عاشق الٰہی میرٹھی)

[2] تعویز و عملیات سے حضرت کو کوئی لگاؤ نہ تھا بلکہ اسکو پسند بھی نہ فرماتے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ایک جن کا دفعیہ

برادری کی ایک بی بی پر جن کا اثر ہوا۔ تعویذ کی درخواست آئی چونکہ آپ عامل نہ تھے اور آثار سے جن کا قوی ہونا معلوم ہو گیا تھا اس لئے عذر فرمادیا لیکن جب اسرار زیادہ ہوا تو جن کے نام ایک خط تحریر فرمایا:

''اگر تم مسلمان ہو تو میں تم کو قرآن وحدیث کی وہ وعیدیں یاد دلاتا ہوں جو کسی کو ستانے پر وارد ہوئی ہیں اور اگر تم کافر ہو تو اول ہم صلح کی تحریک کرتے ہیں اور اگر تم نہیں ہٹتے تو یاد رکھو کہ ہم میں بعض ایسے بھی ہیں جو تمہارا پورا پورا انشاء اللہ استیصال کر سکتے ہیں۔''

جب یہ خط اس جن کو سنایا گیا تو اس نے کہا:

''یہ ایسے شخص کا خط نہیں کہ اس کا کہنا نہ مانا جائے اچھا لو میں جاتا ہوں۔''

بیمار کا تندرست ہونا

ایک شخص کا نام ''کلیم اللہ'' تھا وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ بیمار رہتا تھا آپ کے پاس آیا تو آپ نے اس کا نام بدل کر ''سلیم اللہ'' رکھا جس کے بعد وہ بالکل تندرست ہو گیا اس تبدیلی نام کی وجہ خود آپ نے یہ بیان فرمائی کہ ''کلیم'' کے معنی ہیں ''جراحت'' اسلئے اس کا نام بدل دیا!

غبی کا ذہین ہو جانا

ایک صاحب کا لڑکا، معمر ۹ دس برس بہت غبی تھا آپ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ نے مزاحاً وتفریحاً اس کا سر اپنے سر مبارک سے ٹکرایا بس اس کے بعد اسکا ذہن تیز ہو گیا۔

تھے لیکن محض شیخ کے تابع شرعاً جائز اعمال لکھ دیتے تھے چنانچہ اعمالِ قرآنی کے نام سے یہ سب یکجا اور ہر ایک کے لئے عام کر دیئے گئے ہیں اس میں کوئی بات راز کی ہے نہ اجازت کی طالب! (مؤلف)

سوال سے پہلے جواب

یہ تو روزانہ ہی کا معاملہ تھا کہ جو کوئی اپنے ذہن میں اشکال یا غلط خیالات لے کر آتا اس کے اظہار سے قبل ہی وہ اس کا جواب پا کر مطمئن ہو جاتا اور مجلس سے اٹھتے ہوئے اپنے ذہن کو صاف کر چکتا تھا۔ مثلاً ایک واقعہ استاذی مولانا عبد الجبار صاحب حیدرآبادی (حال خطیب لال مسجد عقب بولٹن مارکیٹ کراچی) کا سنئے۔

دارالعلوم دیوبند میں پڑھ رہے تھے ابوالکلام صاحب کی تقریر وتحریر سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ بیشتر وقت الہلال کے نوک زبان کرنے اور سیاسی رنگ ڈھنگ اختیار کرنے میں مصروف ہونے لگا اسی دوران میں پہلی مرتبہ اور طلبہ کے ساتھ تھانہ بھون حاضری ہوئی، صاحب دل شیخ کی نظر نے شاید اس جوہر کا اندازہ بھی لگایا اور اس پر جو گرد جم رہی تھی اس کو بھی دیکھ لیا۔ مولوی صاحب کو بلا کر اپنے بالکل برابر شانہ بہ شانہ بٹھایا اور طالب علمی کے زمانہ میں سیاسیات سے دلچسپی کی مضرت پر تقریر فرمائی اور تمام تر انہی کے خیالات کی تردید کی اور اس دوران میں مزاحاً ان کے سر کو اپنے سر مبارک سے ٹکرایا بھی۔ صاحب واقعہ کا بیان ہے کہ اس دن سے ان کو نہ صرف سیاسیات سے نفرت ہوگئی بلکہ علم دین سے اس درجہ شغف بڑھا کہ پھر وہ مدرسہ کے اعلیٰ امتحان میں سب طلبا پر فوقیت لے گئے۔

کشف حال

حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی احقر نے سنا کہ ایک مرتبہ مفتی صاحب کو دوسو روپیہ قرض ہوگیا تھا اور ادائی کی فکر لاحق تھی، ایک موقع ایسا آیا کہ اگر اس سے فائدہ اٹھایا جاتا تو قرض ادا ہو جاتا لیکن عین انہی دنوں میں تھانہ بھون جانے کا قصد تھا، اس لئے ہمت کر کے حکیم الامت کی خدمت میں حاضری ہی کو ترجیح دی، یہ وہ زمانہ تھا کہ مفتی صاحب ممدوح کو ابھی محفل میں کلام کی اجازت نہیں تھی۔ جب مفتی صاحب تھانہ بھون تشریف لائے اور سلام کے بعد مصافحہ کیا تو حکیم الامت نے انکے ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تین مرتبہ جوش سے فرمایا "دوسو روپیہ ۲۰۰ بھی کوئی چیز ہے" علماء کے جوتیوں کی گرد ہے! بس اس جملہ سے مفتی صاحب کی ساری ذہنی کاوش رفع ہوگئی!

تھانہ بھون میں بیٹھے ہوئے علیگڑھ میں پایا جانا

علیگڑھ میں حکیم الامت کے ایک معتقد نے نمائش میں دوکان لگائی تھی ایک روز عین فروخت کے وقت ان کے قلب میں وحشت سی شروع ہوئی اور انہوں نے نقصان کا خیال کئے بغیر سامان قبل از وقت سمیٹنا اور صندوق میں بھرنا شروع کیا صندوق بھر چکے تھے کہ نمائش میں آگ لگ گئی ان کو پریشانی ہوئی کہ اکیلے ایسے وزنی صندوق کس طرح اٹھائے جائیں۔ عین اس پریشانی میں دیکھا کہ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ آئے ہیں اور فرما رہے ہیں ''جلدی کرو'' چنانچہ ایک طرف سے مالک دوکان اور دوسری طرف سے حضرت شیخ نے پکڑ کر ایک ایک صندوق کر کے سارا سامان بچالیا جب سامان اٹھ چکا تو حضرت وہاں سے غائب تھے اور در حقیقت اس وقت آپ تھانہ بھون میں تھے جب آپ سے یہ واقعہ بیان کیا گیا تو فرمایا:

''مجھ کو اس کی کچھ خبر نہیں البتہ بعض اوقات حق تعالیٰ کسی کی دستگیری اور اعانت اس صورت سے فرماتے ہیں کہ کسی لطیفہ غیبیہ کو کسی مانوس شکل میں ظاہر فرمادیا اور اس کے ذریعہ سے اس کا کام بنوادیا اور خود اس شکل والے کو کچھ خبر نہیں ہوتی۔''

آپ کے مریدین کا خاتمہ بخیر ہونا

یہ بھی آپ کی بڑی برکت ہے کہ آپ کے متوسلین کو ''حسن خاتمہ'' کی دولت ملتی رہی ہے، جو ہر دولت سے بالاتر ہے حضرت خود بھی فرماتے تھے:

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ کی یہ برکت ہے کہ جو بلا واسطہ یا بالواسطہ حضرت سے بیعت ہو اس کا بفضلہٖ تعالیٰ خاتمہ بہت اچھا ہوتا ہے حق تعالیٰ ہر مسلمان کو حسن خاتمہ کی نعمت عطا فرمائے۔

یہ عنوان اتنا وسیع ہے کہ ایک مستقل کتاب تیار ہو جائے مگر چونکہ مسلک اشرفیہ میں اس کو اتنی اہمیت نہیں اس لئے اس اختصار ہی پر اس کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ حق بھی یہی ہے کہ کرامات کی حیثیت غازہ کی سی ہے اور بقولِ عارف شیرازی۔ ع

بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت رُوئے زیبا را

باب چہارم
مسلک اشرفیہ

اعتدال

یہ کیا حال ہوگیا ہے کہ جدھر نظر اٹھتی ہے افراط ہی افراط ہے یا پھر تفریط ہی تفریط، اعتدال کی تلاش میں نظر حیراں و درماندہ رہ جاتی ہے ایک طرف ترقی کا یہ عالم کہ انسانی آنکھ میلوں دور تک دیکھنے لگی۔ کان دنیا کے ہر گوشہ کی خبر سننے لگے، اس کے دسترس میں بہتی ہوئی ہوا اور ٹھاٹھے مارتا ہوا سمندر بھی آ گیا اس کے ذہن نے شمس وقمر کے فاصلوں کو ناپ لیا اور وہاں کی کیفیات کو بھانپ لیا۔ مگر رخ کو ذرا دوسری طرف پھیر کر دیکھئے کہ اس کے قلب سے احترام انسانیت مٹ گیا، نرمی و مروت جاتی رہی۔ دوستی و دشمنی، حق پسندی وحق شناسی کے جواہر اس نگین سے نکل گئے، اب دوستی ہوگی تو ایسی کہ دوست کی خاطر دین تک قربان ہو سکے گا اور دشمنی ہوگی تو ایسی کہ پھر مخالف کی نیکی بھی خیانت سمجھی جائے گی۔ کسی کی مدح سرائی ہوگی تو عرش وفرش کے قلابے ملا دیئے جائیں گے۔ اور اگر کسی کی رد میں قلم اٹھے گا تو اس کی عزت وآبرو معرض خطر میں آ جائے گی۔ لیکن خیر اس عالم بے اعتدالی میں خال خال ایسی ہستیاں بھی ملیں گی جن کا قدم اعتدال کے پل صراط پر ڈگمگایا نہ ہوگا۔ جن کی نظر نے اپنے اور پرائے موافق ومخالف کے عیب وہنر دیکھنے میں قصور نہ کیا ہوگا اور جن کا قلم تنقید وتبصرہ میں مبالغہ وغلو سے بچ کر نکلا ہوگا، اسی صفت ''اعتدال'' سے متصف ہستیوں میں ایک اعلیٰ نمونہ حکیم الامت کی ذات ہے، یہ آپ کی معتدل مزاجی کا ایک کرشمہ تھا کہ ہر بات کا مقام ومحل پہچانتے اور اس کے مطابق طرز عمل اختیار فرماتے تھے۔ روزانہ کی بات تھی کہ ابھی کسی زیر تربیت کی غلطی پر غضبناک ہو رہے ہیں اور اس درجہ اظہار غضب ہو رہا ہے کہ شاید اب جو بھی آئے اس عتاب سے بچ نہ سکے گا، مگر نہیں عین اس حالت میں جب کوئی شخص لائق التفات وشفقت آ جاتا تو سارا غضب، محبت و

شفقت میں بدل جاتا اور دیکھنے والے حیران رہ جاتے کہ ابھی گرج رہے تھے برس رہے تھے اور ابھی مسکرانے کھلکھلانے لگے یعنی آپ ''ابو الحال'' تھے، چنانچہ گذر چکا کہ ایک اہلیہ کے پاس ہوتے تو دوسری کا تصور تک آنے نہ پاتا، یہ کمال بہت کمیاب ہے۔

آپ نے اپنے اور پرایوں کو قرآن وحدیث کی میزان میں تولا۔ اور جو جتنا اترا ہے اس کا حق ادا کیا ہے ان کی طبعی وجبلی مجبوریوں، ذہنی وفکری خطاؤں، حالی ومقالی لغزشوں کی حدود شرع کے اندر تاویلات کی ہیں اور حسن ظن کی تلقین فرمائی ہے اور ان کی جو باتیں دائرۂ شریعت میں نہ آسکیں ان پر سکوت کیا ہے البتہ جو چیزیں حرم شریعت سے ٹکرائیں ان کا صاف صاف رد کیا، مگر صاحب قول پر لعن طعن اور سب وشتم سے پھر بھی گریز کیا ہے۔ یہ آپ کی سیرت کا اعلیٰ ترین وصف ہے اعتدال کے اس پل صراط پر چلنا کوئی آسان کام نہیں ؂

آہستہ کہ رہ بر سرِ تیغ ست قدم را

آئندہ عنوانات میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اسی میانہ ومعتدل مسلک کی وضاحت ہوگی اور دکھایا جائے گا کہ کس طرح ہر معاملہ میں آپ نے نہایت محتاط، غیر دل آزار لیکن مستحکم پہلو اختیار فرمایا ہے خود فرماتے تھے کہ انسان کو ریشم کا رسا ہونا چاہئے کہ پکڑو تو نہایت نرم لیکن توڑنا چاہو تو ہاتھی کے زور سے بھی نہ ٹوٹ سکے، یعنی کہ مسلک ومشرب میں تو نہایت سخت ہو لیکن اس کی تلقین واشاعت کا وہ ڈھنگ اختیار کرے کہ کسی مخالف کا بھی دل مجروح ہونے نہ پائے کیونکہ جب تک دل سے دل نہ ملے گا اثر وفیضان کیسے ہوسکے گا؟ تبلیغ دین کا یہ ایک اہم ترین نفسیاتی نکتہ ہے جس کی اصل قرآنِ حکیم کے اس ارشاد میں ملتی ہے کہ:

''کفار کے بتوں کو برا بھلا نہ کہو!''

حالانکہ سب جانتے ہیں کہ فرقانِ حمید کا کام ہی یہ ہے کہ کفر وایمان، گمراہی وہدایت اور ظلمت ونور کو ممیّز کر دکھائے۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اعتدال پسندی پر عمومی نظر[1]

از حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

افراط و تفریط سے ہٹ کر زندگی کے جس مسئلہ پر اور جس شعبہ میں بھی آپ اعتدالی روش اختیار کریں گے، تو اچانک معلوم ہوگا کہ آپ تنہا رہ گئے۔ اور آپ کے ساتھ کوئی باقی نہ رہا۔ وجہ اس کی ظاہر ہے کہ اکثریت عموماً نقطۂ اعتدال سے ہٹ کر انحرافی زندگی بسر کر رہی ہے، ایسی صورت میں ''اعتدال'' پر قائم رہنے والوں کے ساتھ کوئی نہ ہو۔ ہاں ہوں تو تھوڑے بہت آدمی ہوں۔ یہ تعجب کی بات نہ ہوگی، آج کتنے ہیں جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ سے عقیدت رکھتے ہیں۔ لیکن مولانا کی طبیعت کا جو رنگ تھا۔ ذیل کی چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہوسکتا ہے:

(۱) عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مولانا ضوابط وقوانین کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے۔ جن لوگوں کے مزاج میں سختی ہے۔ اپنی سختیوں میں ہمیشہ وہ مولانا کے اسی اصول سے تسلی حاصل کرتے ہیں۔ خیال یہ کرلیا گیا ہے کہ رورعایت کا مولانا کی فطرت میں کوئی عنصر نہ تھا۔ مگر یہ تو لوگوں نے سمجھا ہے۔ خود مولانا کا حال یہ تھا کہ آپ کی مجلس مبارک میں کبھی ادھر ادھر کی خبروں کا ذکر لوگ چھیڑ دیتے۔ بعض سختی پسندوں نے عرض کیا کہ حضرت کی مجلس میں اس قسم کی چیزوں کا تذکرہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بھی کہا کہ

---

[1] حضرت مولانا مناظر احسن رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ ''کمالاتِ اشرفیہ'' (جو مولانا محمد عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے جمع کردہ ملفوظات اشرفیہ ہیں) لگی بس اس ایک کتاب ہی سے چند جواہر چن کر یہ مضمون تحریر فرمایا تھا جو پہلے ماہنامۂ دارالعلوم دیوبند میں اور پھر ماہنامہ مستقبل (کراچی) بابت اکتوبر ۱۹۵۴ء میں چھپا تھا، مناسبت کی وجہ سے اور تحفظ اثر کے طور پر اب شریک کتاب کر دیا گیا ہے۔ (مؤلف)

بعضوں کو اس پر اعتراض بھی ہے کہ مشائخ وصوفیہ کی مجلسوں میں حقائق و معارف کے سوا ادھر ادھر کی عام خبروں کا ذکر واذکار اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ مولانا نے فرمایا:

''کوئی میرے پاس آ کر بات کرے اور میں منہ موڑ لوں تو اس کو صدمہ ہوگا''

پھر اپنی معتدل فطرت کے فطری مذاق کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

''زائد از کار باتوں کی برائی میرے نزدیک دل شکنی سے کم ہے'' (کمالاتِ اشرفیہ ص ۱۷۳)

یہ آخری الفاظ مولانا تھانوی کے ہو سکتے ہیں؟ میں خیال کرتا ہوں کہ ان کو قریب سے دیکھنے والے بھی تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ جائیں گے مگر کیا کیجئے کہ یہی واقعہ ہے لوگ اس کا خیال نہیں کرتے کہ خود اعدل خلق اللہ ﷺ کا طریقہ عمل اس باب میں کیا تھا۔ معمولی بڑھیا ہاتھ پکڑ کر دیر تک اپنی غیر ضروری باتوں میں مشغول رکھتی ہے اور آپ سنتے رہتے ہیں، کیا صحیح حدیثوں میں یہ نہیں آیا ہے؟ مولانا ہی فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ کا بھی مذاق تھا کہ ملنے والے جب تک بیٹھے رہتے، ان سے گفتگو کرتے رہتے۔ مقصود یہی تھا کہ اگر ایسا نہ کیا جائے، تو بے رخی کا احساس دلوں میں پیدا ہوتا ہے، جو عموماً موجب دل شکنی بن جاتا ہے۔ مجلس نبوی ﷺ کی خصوصیت صحابہ کرام کیا بیان کرتے تھے:

یضحک مما یضحکون و یتعجب مما یتعجبون

''لوگ جن باتوں پر ہنستے آنحضرت ﷺ ان پر ہنستے' جن باتوں پر لوگ تعجب کرتے حضور ﷺ بھی تعجب فرماتے۔''

دل شکنی کا خیال یہاں تک تھا کہ رسول اللہ ﷺ مصافحہ کرنے والے کا ہاتھ خود بھی نہیں چھوڑتے تھے جب تک کہ وہی نہ چھوڑ دیتا۔ کسی سے رخ نہ پھیرتے تھے۔ جب تک وہی نہ پھیر لیتا۔ خود حکیم الامت قدس سرہٗ اپنا ایک خواب بیان فرماتے تھے کہ ملکۂ وکٹوریہ جس زمانہ میں زندہ تھی، آپ نے خواب میں اس کو دیکھا، ایک ایسی گاڑی پر جس میں نہ گھوڑے ہیں اور نہ باگ نظر آتی تھی (موٹر کار اس وقت تک ایجاد نہیں ہوئی تھی) بہر حال خواب میں معلوم ہوا کہ مولانا سے کہہ رہی ہے کہ ''اسلام ہی مجھے حق مذہب معلوم

ہوتا ہے، البتہ مجھے ایک شبہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام لوگوں سے مذاق کیوں کرتے تھے؟ نبوت تو بڑی چیز ہے، عام تہذیب میں بھی اس کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔'' خواب ہی میں حضرت فرماتے ہیں، میں نے ملکہ سے کہا کہ لوگوں کو مانوس بنانا مقصود تھا، ورنہ حضور ﷺ کے رعب کی وجہ سے لوگ کھل کر حضور ﷺ سے دل کی باتیں نہیں کہہ سکتے تھے۔'' ملکہ اس جواب کو سن کر مطمئن ہوگئی۔ دیکھا آپ نے! مولانا کی نظر کہاں پہنچی۔ بیداری میں نہیں، خواب میں بھی دماغ وہیں پہنچا تھا، جہاں اس کو پہنچنا چاہیے۔

(۲) عام طور پر مولانا کے جس مذاق کو لوگوں نے مشہور کیا ہے اس کے حساب سے آپ ہی بتایئے کہ اس سوال کا جواب یعنی ایک ڈاڑھی منڈانے والے کے ساتھ لڑکی کا رشتہ کروں یا نہ کروں؟ ایک صاحب نے یہ لکھتے ہوئے سوال کیا کہ ڈاڑھی والے جو ملتے ہیں تو دال روٹی کا ان کے یہاں اطمینان نہیں اور جہاں اس کی تھوڑی بہت امید ہے وہاں خرابی یہ ہے کہ ڈاڑھی منڈانے والے لڑکے ملتے ہیں۔ مولانا کے مذاق شناسی کے مدعی خود سوچیں کہ اس کا وہ کیا جواب دیں گے مگر سنئے مولانا نے کیا جواب دیا:

> ''میرا خیال ہے کہ اس زمانہ میں پوری دینداری ڈاڑھی والوں میں بھی نہیں۔ پس ایک ڈاڑھی منڈانے کا گناہ کر رہا ہے دوسرا شہوت پرستی کا گناہ کر رہا ہے، تو نری ڈاڑھی لیکر کیا کریں گے۔'' (کمالاتِ اشرفیہ ص ۲۳۹)

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے بڑے نکتہ کی طرف اس میں اشارہ فرمایا ہے۔ لوگوں نے خاص خاص گناہوں کو پکڑ لیا ہے گویا گنہگار ہونے نہ ہونے کا معیار بس صرف وہی ہیں۔ ان ہی گناہوں میں ایک ڈاڑھی بھی ہے۔ ایک شخص غیبت کرتا ہے بدنظر ہے اور عملی طور پر بے احتیاط ہے۔ لیکن لمبی ڈاڑھی رکھتا ہے، اس پر لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ ایک بے چارہ ان عیوب سے بری ہے صرف ڈاڑھی منڈانے کا گناہ کرتا ہے تو سمجھا جاتا ہے ڈاڑھی والے صاحب سے ڈاڑھی منڈانے والے کو کیا نسبت، حالانکہ جیسے ڈاڑھی منڈانا گناہ ہے، ڈاڑھی والوں کے گناہ اس سے کم نہیں؟ پھر ایک ڈاڑھی پر

اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے؟ مولانا نے صحیح فرمایا ہے کہ داڑھی منڈانے کے سواء اور باتیں لڑکے میں اچھی ہوں تو اس کو گوارا کر لیا جائے بلکہ اس برتاؤ سے اغلب ہے کہ داڑھی کا مسئلہ بھی اس کی سمجھ میں آ جائے گا، ورنہ جو طریقہ لوگوں نے داڑھی کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے، میں دیکھتا ہوں کہ منڈانے والوں کی جرأتوں کو اس طریقے نے اور بڑھا دیا ہے۔

(۳) مولانا چونکہ خود مولوی تھے۔ اس لئے مولویوں کا خیال ہوگا کہ انگریزی تعلیم یافتوں پر ضرور مولویوں کو ترجیح دیتے ہوں گے۔ اور اس میں شک نہیں کہ عربی خواں مولویوں کا مولانا خاص طور پر احترام فرمایا کرتے تھے۔ مگر ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ:

انگریزی دانوں میں اور جتنی باتیں بھی ہوں، لیکن "ان کی گفتگو میں مزہ آتا ہے، کیونکہ یہ سمجھ میں آنے سے مان لیتے ہیں۔" (کمالاتِ اشرفیہ ص ۳۳۹)

مولویوں کے اس طریقے کو کہ جو بات منہ سے نکل گئی اس کی پچ کئے چلے جاتے ہیں، سخت ناپسند فرماتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب کا فقرہ "اڑیل ٹٹو" اس قسم کے مولویوں کے متعلق نقل فرمایا اور کہا کہ "جمود و اصرار بری چیز ہے، پھر حکمت کی بات یہ فرمائی کہ "غلطی پر اصرار آدمی کو لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کر دیتا ہے۔ لوگ اس شخص کی تعریف کرتے ہیں۔ جو اپنی غلطیاں مان لیتا ہے۔"

(۴) انگریزی خواں بیچارے بھی تو بہر حال مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ اسلامی گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ غیر مذاہب کے لوگوں سے ملنے جلنے کا طریقہ کیا تھا۔ اس قصہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے جب آپ اعظم گڑھ تشریف لے گئے تھے راستے میں کسی اسکول کے سامنے سے گذر ہوا، جہاں زیادہ تر ہندو اساتذہ تھے۔ مولانا نے فرمایا کہ مجھے گذرتا دیکھ کر سارے ہندو اساتذہ اور طلبہ بھی تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس حال کو دیکھ کر مولانا فرماتے ہیں کہ:

"میں وہاں رکا اور ان سب سے ملا۔ لوگوں سے میں نے مصافحے کئے۔"

پھر خصوصیت کے ساتھ ارشاد ہوا کہ:

''ایک ایک سے ملا۔حتیٰ کہ ہندوؤں سے بھی اور مزاج پرسی کی۔''

(کمالاتِ اشرفیہ ص ۳۷۷)

آپ کو معلوم ہے کہ مولویوں کا عام قاعدہ ہے کہ ایسے مدرسہ کے سامنے سے جب گذرتے ہیں اور جیسے حضرت کے ساتھ مدرسہ والوں نے برتاؤ کیا تھا۔اسی برتاؤ کے ساتھ پیش آتے ہیں تو عام طور پر مولوی لوگ ان ہندوؤں کی طرف متوجہ ہونا اپنی شان کے خلاف تصور کرتے ہیں۔پھر حضرت نے اس تنگ دل ملا کا ذکر کیا جس کے وعظ میں ایک غیر مذہب کا آدمی جو شاید ہندو ہی تھا،شریک ہو گیا تھا۔مجلس وعظ میں ہندو کو دیکھ کر ملا صاحب آپے سے باہر ہو گئے گرجنے لگے کہ:

''نکالو اس کافر مردود کو!'' (کمالاتِ اشرفیہ ص ۳۷۷)

(۵) بعض خاص نوعیت کے متعلق مشہور کر دیا گیا ہے کہ دیوبند کی طرف منسوب ہونے والے علماء کا ان مسائل میں یہ خیال ہے۔حتیٰ کہ بے جانے بھی لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ دیوبندی مولوی اس کا یہ جواب دے گا۔مثلاً یہ سوال کہ ''یارسول اللہ'' (ﷺ) کے کہنے کا مسلمانوں میں عام رواج جو پایا جاتا ہے۔دیوبندی مولوی اس کو کبھی جائز نہیں کہہ سکتا۔مگر سنئے دیوبندیوں کے پیشوا کا کیا خیال تھا۔فرمایا کہ:

شوقاً والتذاذا ما ذون فیه (کمالاتِ اشرفیہ ص ۵)

یعنی پیغمبر ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کے قلوب کا جو اشتیاقی تعلق ہے۔اس تعلق کا اظہار یارسول اللہ ﷺ سے اگر کوئی کرتا ہو''یارسول اللہ ﷺ کہنے میں اس کو لذت ملتی ہو،تو مولانا اسی صورت میں یارسول اللہ ﷺ کہنے کی اجازت دیتے تھے۔البتہ استعانةً واستغاثةً فرمایا کہ جائز ہوگا۔

ایسے سینکڑوں مسائل اور امور ہیں جن کے متعلق لوگوں کے عام خیالات اور توقعات کے قطعاً مخالف چیزیں مولانا کے کلام میں ملتی ہیں۔ضرورت ہے کہ ان چیزوں کو نمایاں کیا جائے۔غلط فہمیوں کے ازالہ کے سوا خود مولانا کے عقیدت مندوں کے بہت

سے غلط خیالات کی اس سلسلہ سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اصلاح ہو سکتی ہے۔ میرے پاس اس وقت مولانا کی کتابوں کا ذخیرہ نہیں۔ صرف کمالاتِ اشرفیہ سے سرسری طور پر چند چیزوں کا ارتجالاً انتخاب کرلیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ مولانا رحمہ اللہ علیہ کی زندگی کے بہت سے گوشے جب تک زندہ رہے۔ غایتِ اخفاء کی وجہ سے پوشیدہ رہے۔ کچھ شک نہیں کہ اس زمانہ میں بھی بعض مصلحین نے اپنی قوموں سے چھوت چھات، نسلی تفریق اور اخلاقی خرابیوں کو ختم کرنے کے لئے بڑی کوششیں اور اس راہ عمل میں بڑے مجاہدے کئے ہیں مگر اکثر ان لوگوں کے کاموں میں نمود و نمائش کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ ان کی ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس سے بھی گہری بات وہ ہے جس کی طرف امام غزالی رحمہ اللہ علیہ نے لباس کی بحث میں اشارہ کیا ہے کہ نمائش صرف اچھے کپڑوں ہی کے پہننے میں نہیں ہے، بلکہ اس سے بھی بڑی ریاکاری یہ ہے کہ پھٹے پرانے گودڑ پیوند در پیوند لگے ہوئے کپڑے کے ساتھ اپنے آپ کو اتنا مقید کرلیا جائے کہ جب تک وہ نہ ملے کپڑے ہی نہیں پہنیں گے۔ اسی طرح یہ ضد کہ میں رہوں گا تو فلاں کے پاس اور ٹھہروں گا تو فلاں جگہ مجھے اس میں بھی بجائے بڑائی کے کچھ اس قسم کی بات نظر آتی ہے، جو عموماً چھوٹے لوگوں میں پائی جاتی ہے آخر آپ اس شخص کو کیا کہیں گے جس نے التزام کرلیا یہ کہ کھاؤں گا تو جو ہی کی روٹی کھاؤں گا۔ قورمہ اور پلاؤ پر اصرار کرنے والوں میں اور اس جو کی روٹی میں اپنی غذا کو منحصر کرنے والوں میں کیا فرق ہے۔

خیر! دوسروں سے مجھے کیا بحث!! میں تو مولانا کے متعلق عرض کر رہا تھا کہ خود ہی فرماتے تھے کہ "میرے بھائی اکبر علی نے مجھ سے ایک دن کہا کہ اب تمہارا شمار ہندوستان کے بڑے آدمیوں میں ہے۔ اس لئے چاہیئے کہ سفر کم از کم سیکنڈ کلاس میں تو کیا کرو۔"
حضرت فرماتے ہیں کہ ان کے اس مشورہ کو سن کر میں نے عرض کیا کہ:

"کیا کروں، میری طبیعت کے خلاف ہے، میں ریل میں گنواروں اور بھنگی چماروں کے ساتھ بیٹھتا ہوں۔" (کمالاتِ اشرفیہ ص ۳۷۵)

اسی طرح آج عام انسانی ہمدردی کا دنیا میں کتنا چرچا ہے۔لیکن مولانا نے خود اپنا قصہ جو بیان کیا ہے کہ ''بہاولپور گیا ہوا تھا، گرمی سخت تھی، جیل خانے کے قیدیوں کو پنکھا کھینچنے کے لئے بلایا گیا۔''

مولانا فرماتے ہیں کہ ''پہلے یہی بات مجھے ناگوار ہوئی اور چاہا کہ ان کو واپس کردوں لیکن اس کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ جیل کی زندگی سے ان بے چاروں کو تھوڑی دیر کے لئے اس ذریعہ سے تو رہائی مل جاتی ہے۔یہ سوچ کر واپس کردینے کے خیال کو تو دل سے نکال دیا۔انتظار کرتا رہا جب سب لوگ چلے گئے تو میں نے ان قیدیوں سے کہا:

''پنکھا بند کردو، پھر جی چاہے سور ہو یا بیٹھے رہو کیونکہ بیگار لینا جائز نہیں ہے۔''

فرمایا کہ کھانا آیا تو ان قیدیوں کو بھی کھانا دلوایا۔پھر تو ہر قیدی اسی کی خواہش کرتا تھا کہ میں بلایا جاؤں۔

تصوف اور صوفیہ میں

سلاسل اربعہ

تربیت باطن کے متعدد طریقے اور سلسلے رائج ہیں۔ لیکن ان میں سے چار کو زیادہ شہرت وعمومیت حاصل ہے۔ نقشبندیہ ا جو خواجہ بہاؤالدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ سے چلا ہے، چشتیہ۲ جس کے بانی خواجہ ممشاد علوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، قادریہ۳ جس کی ابتداء شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوتی ہے اور سہروردیہ۴ جس کی پہلی کڑی شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان سلسلوں کا طرزِ اصلاح ایک دوسرے سے مختلف ہے بالکل اسی طرح جس طرح اطبائے یونانی، وید، ایلوپیتھس اور ہومیوپیتھس اپنے اپنے طریقہ علاج میں ایک دوسرے سے متفرق ہیں لیکن ظاہر ہے کہ سب کا مقصود ازالۂ مرض اور صحت کی بحالی ہے۔ یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ بدنی علاج کی بنیاد تو محض عقل وتجربہ پر ہے اس لئے اس میں اختلاف لازمی ہے لیکن روحانی علاج جس کے لئے قرآن حکیم نازل ہوا، اس کے طریقوں میں اختلاف کیوں ہو؟ جواب یہ ہے کہ جس نوع کی روحانی صحت پیدا کرنی ہے اور جس ظاہر کے ساتھ اس کا بقاء منظور ہے وہ تو منصوص ہے لیکن اس میں جس درجہ کا کمال چاہا گیا ہے اور ہر عبادت میں خلوص وللّٰہیت کے علاوہ قناعت، صبر وشکر، توکل اور رضا برقضا وغیرہ کا جو مطالبہ کیا گیا ہے اس کے ذرائع متعین نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں اجتہاد کو دخل ہے اور مجتہد فیہ مسائل میں اختلاف ناگزیر ہے۔ اور یہ کوئی عیب نہیں۔ چنانچہ حکیم الامت نے بارہا فرمایا:

> ''میں دوفنون میں ہر زمانہ میں اجتہاد کا قائل ہوں ایک طب جسمانی اور دوسرے طب روحانی''

غرض صوفیاء کے مختلف سلسلوں کی حقیقت تو بس اتنی ہی ہے۔ مگر بعض کم فہموں نے اس اختلاف کو غلط سمجھا اور ایک دوسرے کی نکیر شروع کی جو انجام کار کے اعتبار سے مہلک ہے کیونکہ ہر سلسلہ میں اللہ کے بے شمار محبوب و مقبول بندے ہیں اور ان کی شان میں گستاخی کرنا (بر بنائے حدیث) اللہ تعالیٰ سے جنگ مول لینا ہے۔ جس میں کوئی جیت نہیں سکتا حکیم الامت نے اس خطرہ کے پیش نظر ''تعلیم الدین'' کے باب عقائد و تصدیقات میں تحریر فرما دیا ہے:

''جس مجتہد اور شیخ[1] سے اعتقاد ہو اس کی پیروی کر کے دوسروں کو برا سمجھنا درست نہیں اور پیروی مجتہد اور شیخ کی اسی وقت تک جائز ہے جب تک ان کی بات خدا اور رسول ﷺ کے خلاف نہ ہو اور اگر ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو اس میں پیروی نہیں۔''

پھر اسی کتاب کے باب ''وصایا'' میں شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں:

''مذاہب میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے کہ حنفیوں کا مذہب سب سے اچھا ہے، یا شافعیہ کا سب سے بڑھ کر ہے اپنے مذہب پر عمل کرتا رہے اور نہ صوفیوں کے طریق میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دے کہ چشتیہ کی نسبت بڑے زور کی ہے، دوسرا کہے واہ نقشبندیوں میں اتباع سنت زیادہ ہے اور اسی قسم کے خرافات سے بچے۔''

عام صوفیائے کرام خصوصاً حضرات چشت

شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصایا کے حوالہ سے جو بات اوپر نقل کی گئی اس میں تو ان لوگوں کا ذکر تھا جو آپس میں خواہ مخواہ ایک کو گھٹاتے دوسرے کو بڑھاتے ہیں۔ لیکن ایک بڑا گروہ ہے جو صرف ''کرمِ کتابی'' ہے اور ''صحبت'' کے فوائد، روحانی لطائف اور الفاظ کے حقائق و معانی سے بے بہرہ ہے، عام صوفیا پر لعن طعن کرتا اور خصوصاً حضرات چشت کو راہِ سنت سے بیگانہ قرار دیتا ہے حکیم الامت نے ''السنۃ الجلیہ فی الچشتیہ العلیہ''

[1] مراد امام فقہ اور شیخ طریقت

نام سے کچھ کم دو سو صفحات کی کتاب تصنیف فرمائی ہے جس میں ان تمام بدگمانیوں کا ازالہ کیا ہے اور ان فتنہ پردازیوں کا پردہ چاک کیا ہے جو نفس پرستوں نے حضرات چشتیہ کی نسبت سماع کے انعقاد، علوم قرآن و حدیث سے بے التفاتی یا کم التفاتی کی جھوٹی روایتیں منسوب کر کے حائل کر دیا تھا، تمہید میں ایک اصولی بات بتائی ہے۔

''مدت سے عام لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بسا ہوا ہے اور جوں جوں جہل کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے اس میں قوت ہوتی جاتی ہے کہ حضرات صوفیہ میں عموماً اور چشتیہ میں خصوصاً شریعت کا اتباع نہیں ہوتا یا کم ہوتا ہے اس سے دو مفسدے پیدا ہوتے ہیں ایک ان حضرات کے معتقدین میں دوسرا غیر معتقدین میں۔''

''معتقدین کے اعتقاد میں خود شریعت ہی کا اتباع اس خیال سے ضروری نہیں رہا کہ ضروری ہوتا تو خود یہ حضرات ہی متبع ہوتے اور غیر معتقدین میں یہ مفسدہ ہوتا ہے کہ ان کے اعتقاد میں شریعت واجب الاتباع ہے مگر چونکہ یہ حضرات ان کے زعم میں متبع نہیں اس لئے وہ ان کی شان میں گستاخی کرنے لگے اول مفسدہ تو سرحد کفر سے ملا ہوا ہے کہ اس میں جمود (انکار) شریعت مقدسہ کا جس کا جواب نصوص قطعیہ سے ثابت ہے اور دوسرا مفسدہ گو کفر نہیں، مگر درجۂ بدعت شنیعہ و معصیت قطعیہ تک یقیناً پہنچتا ہے کہ بلا دلیل بلکہ خلافِ دلیل مقبولانِ الٰہی سے بدگمانی اور ان کی شان میں بدزبانی ہے جو نصوص کے خلاف ہے اور نصوص کے خلاف عمل اگر شبہ سے ہے تو بدعت ہے ورنہ فسق و معصیت بلا شبہ ہے۔''

ظاہر ہے کہ صوفیائے کرام کی شان میں ساری بے ادبی و گستاخی کا مدار یہ خیالِ خام ہے کہ یہ حضرات اتباع سنت میں پورے نہیں ہوتے خصوصاً حضرات چشتیہ سے متعلق تو بعض غیر محقق اور نام نہاد صوفی بھی کہہ دیتے ہیں کہ سلسلہ نقشبندیہ میں تو اتباعِ سنت غالب ہے۔ لیکن چشتیہ میں اس کا اہتمام نہیں۔ اب اس کی تحقیق ایک چشتی اور عاشق رسول ﷺ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنئے: فرماتے ہیں:

''حضرات نقشبندیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے متبع سنت ہونے پر قریب قریب سب کو اتفاق

ہے اور صحیح اتفاق ہے مگر خود ان کے طریق میں بعض ایسی چیزیں جو نصوص میں وارد نہیں ''شرط طریق'' ہیں اور شرط بھی اعظم واہم! چنانچہ تصور شیخ باوجود یہ کہ صریحاً کسی نص میں وارد نہیں اور پھر خطرناک بھی ہے اور بعض کو اس میں غلو بھی ہوگیا ہے اور اسی خطرہ وغلو کے سبب مولانا شہید (اسمٰعیل شہید) اس کو منع فرماتے ہیں چنانچہ انوار العارفین ذکر تصور شیخ میں کنز الہدایہ بہ حوالہ مکتوبات حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد نقل ہے:

''ذکر تنہا و بے رابطہ و بے فنا فی الشیخ موصل نیست، ذکر ہر چند از اسباب وصول است لیکن غالباً مشروط برابطۂ محبت وفنا در شیخ است، آرے ایں رابطہ تنہا بارعایت آدابِ صحبت وتوجہ والتفات شیخ بے التزام ذکر موصل است۔''

اور گو چشتیہ میں بھی مثل دیگر طریق کے ایسے اشغال ہیں جو صریح سنت میں وارد نہیں مگر کوئی شغل شرط طریق نہیں بلکہ مطلق شغل بھی شرط نہیں بعض کے لئے صرف ذکر ہی کافی ہوجاتا ہے پس چشتیہ کی شان بالکل حنفیہ کے مشابہ ہے کہ باوجود تمام مذاہب سے زیادہ شدید الاتباع ہونے کے جیسا کہ انکے اصول سے ظاہر ہے اپنے دقیق ماخذ کے سبب مخالفتِ حدیث میں بدنام ہیں اسی طرح چشتیہ کے اصول سے ان کا سنت میں شدید الاتباع ہونا ظاہر ہے جیسے کے اوپر ایک اصل دلیل گذری کہ ان کے طریق میں کوئی امر ایسا شرطِ مقصود نہیں جو سنت میں وارد نہ ہو اور اصول ہی اصل معیار ہیں۔''

اس اصولی گفتگو کے بعد باب اول میں ان حضرات کے بعض وہ اقوال درج ہیں جن میں اتباع سنت کی تاکید فرمائی گئی ہے باب ثانی میں بعض وہ افعال نقل کئے گئے ہیں جن سے خود ان کا شدید الاتباع ہونا ثابت ہوتا ہے اور باب ثالث میں بعضے ایسے اقوال یا افعال کی توجیہہ فرمائی گئی ہے اور انکے اشکال رفع کئے گئے ہیں جن سے بادی النظر میں عدم اتباع سنت کا وہم ہوتا ہے [1]۔ اب بھی اگر کوئی صوفیائے کرام اور خصوصاً حضرات

[1] اس سلسلہ میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت جلد دوم مولفہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی بصیرت افروز ہے (مؤلف)

چشتیہ سے متعلق بدگمانی رکھے تو اسے اختیار ہے لیکن پھر وہ اپنی عاقبت کی خیر منائے!

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْ رَبَّنَا اِنَّکَ رَؤُوْفٌ رَّحِیْم

شیخ اکبر کی نسبت آپ کا مسلک

گروہ صوفیہ میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی المعرف بہ شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ایسی ہے جس کے مؤید اور غیر مؤید دونوں تائید یا عدم تائید کے وقت جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں حکیم الامت کی میانہ روی ملاحظہ ہو:

تیسرا مسلک حضرت شیخ قدس سرہٗ کے باب میں یہ ہے کہ بنا بر شہادت جم غفیر اکابر امت جس کی حجت انتم شهداء فی الارض سے ثابت ہے شیخ کی مقبولیت و ولایت کا عقیدہ کامل رکھتا ہوں اور شیخ کے اکثر علوم جواز قبیل اسرار ہیں اور میرے فہم سے خارج ہوں عقلاً نہ ان کے اثبات کا حکم رکھتا ہوں بامتثال لاتقف مالیس لک به علم اور نہ ان کی نفی کا بأ تمامہ آیت بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمه اور بلا ضرورت شرعیہ ان کی اشاعت واشتغال کو مضر سمجھتا ہوں بحکم آیت و اما الذین فی قلوبهم زیغ فیتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة وابتغاء تاویله اور طبعاً ان کے قول کی طرف توجہ کرنے سے قلب میں اطمینان نہیں پاتا ہوں اس لئے مطابق حدیث دع ما یریبک الی ما لا یریبک ان کا استحضار نہیں کرتا اور جن علماء نے حفاظت شریعت کے لئے حدود شرعیہ کے اندر رہ کر اقوال شیخ بلکہ شیخ پر نکیر کیا ہے ان کو حسب آیت لا یکلف اللہ نفساً الا وسعها اور حدیث انما الاعمال بالنیات پر محمول کرتا ہوں، اور اس مجموعی مسلک میں اپنے کو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ متوافق دیکھتا ہوں جیسا کہ ان کے بعض مکتوبات سے ظاہر ہے البتہ مجدد صاحب میں یہ امر مزید ہے کہ وہ ان کے اقوال پر کلام بھی کرتے ہیں جو بوجہ ان کے محقق و صاحب کشف ہونے کے ان کا حق ہے اور ہم یہ منصب نہیں رکھتے، بقول عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ۔

"آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ
برنتا بد کوہ را یک برگِ کاہ"

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ

باب توازنِ طبع کے ختم پر حضرت کی ایک تحریر نقل کی جاچکی جس میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے بعض مسائل میں شدت اختلاف کے باوجود ان کے رد میں سخت الفاظ کے استعمال سے اپنی برأت ظاہر کی گئی ہے، ذیل میں مسئلہ توسل سے متعلق حکیم الامت کی توضیح اور ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی شدت کی توجیہ نقل کی جاتی ہے، جس سے صاحب سوانح کا اعتدال مسلک نمایاں ہوگا۔ فرمایا:

"ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ توسل اعمالِ صالحہ سے تو مطلق جائز ہے اور عیان میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ زندہ ہوں تو بایں معنی جائز ہے کہ ان سے دعا کی درخواست کی جاتی ہے اور اموات سے ناجائز کیونکہ وہاں یہ معنی متحقق نہیں اور اس پر احادیث سے استدلال کیا ہے، چنانچہ توسل بالاعمال کے جواز پر بخاری کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ تین آدمی ایک غار میں بند ہوگئے تھے اور تینوں میں سے ہر ایک نے اپنے ایک ایک عمل سے توسل کیا یعنی اسکا واسطہ دے کر نجات کی دعا کی اور وہ دعا قبول ہوگئی۔ پھر توسل بالاعیان کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ لکھا ہے کہ انہوں نے استسقاء میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے تو توسل کیا جس کے وہی معنی ہیں کہ ان سے دعا کی درخواست کی اور حضور سے توسل نہیں کیا، اگر غیر احیاء سے توسل جائز ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے توسل کو اختیار فرماتے!

"توسل بالاعمال" کو تو ابن تیمیہ بھی جائز کہتے ہیں، اس لئے اگر میں ان کے زمانہ میں ہوتا یا وہ میرے زمانہ میں ہوتے تو میں نہایت ادب سے عرض کرتا کہ حضرت اس توسل بالاعمال کی حقیقت ہے کیا؟ میری سمجھ میں تو اس کی یہ حقیقت آئی ہے کہ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اے اللہ فلاں عمل کے طفیل و صدقہ میں یہ کام

کردے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اے اللہ یہ عمل آپ کے نزدیک محبوب ہے اور آپ کا وعدہ ہے کہ آپ کے عمل محبوب سے جس کو تلبس ہو اس پر خاص رحمت ہوتی ہے اور اس عمل کے ساتھ ہم کو بھی کسب وصدور کا تلبس ہے لہٰذا اس تلبس پر جو وعدہ رحمت کا ہے ہم آپ سے اس رحمت کو طلب کرتے ہیں۔اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اگر کوئی ''توسل بالاعیان'' بھی کرے تو توسل بالاعیان اور توسل بالاعمال میں کیا فرق ہے؟ پھر خواہ وہ اعیان احیا ہوں یا اموات کیونکہ اب اس توسل بالاعیان کا حاصل یہ ہوگا کہ اے اللہ یہ بزرگ زندیا مردہ آپ کے محبوب ہیں اور آپ کا وعدہ ہے کہ آپ کے محبوب سے جس کو تلبس ہو اس پر رحمت ہوتی ہے اور ہم کو ان بزرگ کے ساتھ عقیدت ومحبت کا تلبس ہے اس لئے ہم آپ کی اس رحمتِ موعودہ کے طلبگار ہیں۔اب فرمایئے کہ اس میں احیا اور اموات کا کیا فرق رہ گیا؟ مجھ کو یقین ہے کہ اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد ابن تیمیہ اگر زندہ ہوتے تو علی الاطلاق توسل بالاعیان الموتٰی کی ممانعت سے رجوع فرمالیتے! مگر اب بھی میں ان کے قول کی یہ توجیہہ کرتا ہوں کہ توسلِ ممنوع سے مراد ان کی وہ توسل ہے جو فریاد و استغاثہ تک پہنچا ہوا ہو، اور مطلقاً توسل بالموتٰی کی ممانعت نہیں کرتے ہیں۔یا یہ توجیہہ کی جائے کہ توسلِ ممنوع تو وہی توسل ہے جو فریاد و استغاثہ کی شکل میں ہو مگر انہوں نے سدأللباب مطلقاً ممانعت کردی تاکہ عوام جائز توسل سے ناجائز میں نہ پھنس جائیں، کیونکہ توسل صرف مباح اور جائز ہی ہے، مقاصد و واجبات سے تو ہے نہیں اور جس جائز امر سے فتنہ و گمراہی پھیلنے کا اندیشہ ہو اگر اہلِ علم اس سے روک دیں تو کچھ مضائقہ نہیں!'' (ملفوظات ''اسعد الابرار'')

حسین ابن منصور حلاج

زمرہ عشاق میں شاید سب سے زیادہ بدنام شخصیت منصور حلاج کی ہے جو اصل میں حسین ابن منصور ہیں ان سے متعلق حکیم الامت نے ایک تحقیقی رسالہ ''القول المنصور فی ابن منصور'' کے نام سے تحریر فرمایا۔اس کی ابتداء میں ایک اصولی بات لکھی ہے:

''کسی غیر مقبول کے ساتھ حسن ظن رکھنا مضر نہیں اور مقبول سے بلا وجہ بدگمانی کرنا مضر ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی رذیل کے ساتھ شریفوں جیسا معاملہ کرنا برا نہیں لیکن کسی شریف کے ساتھ رذیلوں جیسا برتاؤ بہت برا ہے۔''

پھر خاتمہ پر ارشاد ہے:

''ایسی سخت سزا اور سنگین مصیبت کو اس درجہ صبر و استقلال کے ساتھ اور خندہ پیشانی سے تحمل کرنا نہ کسی زاہد خشک سے ممکن ہے نہ کسی ساحر زندیق سے اور عین اس حالت میں نشۂ توحید سے سرشار ہو کر محبت و عشق الٰہی کا ایسا دردانگیز اظہار کرنا کہ مشائخ وقت بھی نعرۂ حسب الواحد افراد الواحد لہ سن کر رقت پذیر ہو گئے اور اس دردانگیز حالت میں شبلی رحمۃ اللہ علیہ جیسے امام طریقت کے ساتھ سوالات کا جواب دینا ابن منصور کی جس شانِ یکتا کو ظاہر کرتا ہے، زمانہ کی نگاہ نے اس کا نظارہ بہت کم کیا ہوگا۔ پس حقیقت یہ ہے کہ ابن منصور کا واقعۂ قتل اور سانحۂ ہوش ربا ہی ان کے سچے صوفی، عاشقِ فانی محبوبِ سبحانی، اور صاحب استقال لاثانی ہونے کی بڑی دلیل ہے رہا یہ امر کہ اس مجمع میں کسی نے بھی ان کی اس حالت استقامت اور مستی محبت درجۂ کمال سے ان کی ولایت و معرفت پر کیوں نہ استدلال کیا؟ تو اہلِ بصیرت نے ضرور کیا ہوگا۔''[1]

ایک عام اصول اور اہم انتباہ

اب حکیم الامت کی ایک جامع نصیحت درج کی جاتی ہے جس سے ان کے عام اعتدالی مسلک کی پوری پوری وضاحت ہوگی اور ہر ایک کو اپنے مسلک کی درستی کا موقع ملے گا ارشاد ہوتا ہے:

''جن حضرات میں قبول کے علامات ظاہر ہیں اور منجملہ ان علامات کے علمائے

---

[1] منصور حلاج کی شہادت سے متعلق مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ یہ وزیر حامد کی سازش و عداوت کا نتیجہ تھی۔ فرماتے ہیں۔

چوں قلم در دست غدارے فتاد　　لاجرم منصور بر دارے فتاد　　(غ۔م)

محققین کا حسن ظن بھی ہے، ان کے ساتھ حسن اعتقاد رکھے، اور ان کے کلام میں اگر کوئی امر ظاہراً خلاف سواد اعظم دیکھے تو اپنا اعتقاد اس کے موافق نہ رکھے۔ نہ اس کو کسی کے سامنے نقل کرے، نہ ایسی کتابوں کا خود مطالعہ کرے جب تک کسی شیخ سے نہ پڑھ لے کیونکہ ان حضرات کا مقصود عوام کے لئے تدوین نہیں بلکہ عوام سے اخفا فرمانا تھا لہٰذا اعتقاد سواد اعظم کے موافق رکھے اور اس کلام میں اگر تاویل ممکن ہو تو تاویل کرے ورنہ غلبۂ حال پر محمول کرے یا دشمنوں کے ملحق کر دینے کا احتمال کرے یا مثل متشابہات کے اس کو مفوض بہ حق کرے کیونکہ گو وہ معصوم نہ تھے لیکن شریعت کے بے حد متبع تھے چنانچہ غیر معذور سے اگر کوئی فعل خلاف شریعت ظاہر ہو تو اس پر ان سے خود نکیر منقول ہے اور اس لئے احکام میں خود ان سے ایسا امر منقول نہیں (جو شریعت کے خلاف ہو) صرف بعض ''اسرار'' منقول ہیں جن کی بنیاد ذوق و کشف پر ہے اور تعبیر خاص اصطلاح میں کی گئی ہے اور ان دونوں چیزوں سے چونکہ عوام اور اہلِ ظاہر بے بہرہ ہیں اس لئے ان کے کلام کے معارضِ شریعت ہونے کا یہ لوگ فیصلہ نہیں کر سکتے، گو ظاہری (علم و فضل کے اعتبار سے) ان سے بڑھے ہوئے ہوں اس لئے ان کو اجمالاً تسلیم کر لینا چاہئے ورنہ گستاخی سے سوئے خاتمہ کا اندیشہ ہے!!

البتہ جو شخص ایسا ہی محقق ہو اس کو حق ہے کہ ایسے کلام پر مفصلاً رد کرے، خواہ ''خطائے اجتہادی'' کے درجہ میں اور خواہ ''ابطال'' کی حد تک!''

مجاہدات اربعہ

صوفیانہ مجاہدات میں چار چیزیں مشہور و عام ہیں اور اہم سمجھی جاتی ہیں:

۱۔ قلت طعام ۲۔ قلت منام ۳۔ قلتِ کلام ۴۔ قلتِ اختلاط مع الانام

یہ مجاہدات حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر اس صدی تک اس طرح متواتر چلے آ رہے ہیں کہ بعض غیر فن داں لوگوں نے ان کو قطعی حیثیت دے دی ہے حالانکہ یہ اور اس قسم کے سارے مجاہدات اجتہادی اور بہ اعتبار زمانہ لائق تبدیلی ہیں۔ ہر صاحب عقل یہ سوچ سکتا ہے کہ آج کل جبکہ لوگوں کے قویٰ اس قدر ضعیف ہو چکے ہیں اور مختلف افکار نے ان کے ذہنوں کو گھیر لیا ہے۔ قلت طعام اور قلت منام کے مجاہدات ان کے

لئے کس طرح مناسب و کارآمد ہوسکتے ہیں۔ اسی بدلی ہوئی صورت حال کے پیش نظر اشرفی مسلک سے یہ دونوں چیزیں خارج کردی گئیں ہیں، البتہ کم گوئی اور لوگوں سے کم آمیزی کو حسب حال برقرار رکھا گیا کیونکہ جو مضرتیں زبان اور اجتماع کے ذریعہ اس دور میں پیدا ہیں وہ شائد ہی کبھی رہی ہوں گی۔ مگر یہ بات اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جبکہ زہد کی حقیقت اور مجاہدات کی بنا سمجھ میں آئے خود حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی اس کو سمجھئے۔ فرماتے ہیں:

''زہد ترک لذات کا نام نہیں، محض تقلیل لذات کافی ہے۔ یعنی لذات میں انہماک نہ ہو کہ رات دن اسی فکر میں رہے یہ چیز زہد کے منافی ہے ورنہ اگر بلا تکلف اور بلا اہتمام خاص کے لذات میسر آئیں تو یہ حق تعالیٰ کی نعمت ہے، شکر کرنا چاہئے۔''

''بہت کم کھانا بھی زہد نہیں، نہ یہ مقصود ہے کیونکہ ہمارے کم کھانے سے نعوذ باللہ خدائے تعالیٰ کے خزانہ میں کوئی توفیر تھوڑا ہی ہوجائے گی، ہاں اتنا بھی نہ کھائے کہ پیٹ میں درد ہوجائے، ہمارے حاجی (امداد اللہ) صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق تو یہ تھا کہ نفس کو خوب آرام سے رکھے لیکن اس سے کام بھی خوب لے، میرا تو خیال ہے کہ ''مزدورِ خوش دل کند کار بیش''۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روز فرمایا کہ میاں اشرف علی پانی ہمیشہ ٹھنڈا پیو کہ ہر بن مو سے الحمد للہ نکلے، ورنہ گرم پانی پی کر زبان تو الحمد للہ کہے گی دل شریک نہ ہوگا۔

اسی طرح سونے میں اعتدال رکھے۔ نہ اتنا زیادہ سوئے کہ کسل ہو نہ بہت کمی کرے کہ پوست (خشکی) ہوجائے۔''

البتہ کثرت کلام پر تنبیہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

''زیادہ گوئی قابلِ ترک ہے حضرات عارفین کا مشاہدہ ہے کہ ضروری گفتگو دن بھر بھی ہوتی رہی تو اس سے قلب پر ظلمت کا اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک کنجڑا دن بھر ''لے لو امرود'' پکارتا پھرے تو ذرہ برابر قلب میں اس سے غفلت نہ آئے گی، کیونکہ بضرورت ہے اور بے ضرورت ایک جملہ بھی زبان سے نکل جائے تو دل سیاہ ہوجاتا ہے۔''

اسی طرح لوگوں سے تعلق بڑھانے کو سخت مضر بتایا ہے فرماتے ہیں:

''اگر تم ارتباط بالاحباب کی وجہ سے معمولات کو ناغہ کرو گے تو ایک دن بالکل کورے رہ جاؤ گے، من لا ورد لہ لاوارد لہ۔

سیاسی مسلک میں

دینی مسائل ہوں یا دنیوی ایک مصلح امت جب ان کو پرکھے گا تو اس کی کسوٹی صرف کتاب وسنت ہی ہو سکتی ہے چنانچہ ''ایک پرانے قصبہ کی ایک کہنہ مسجد کے گوشہ میں ایک دور بین زندہ دل مرد درویش بیٹھا ہوا مسلمانوں کے سارے احوال اور ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر نظر ڈال کر حق و باطل۔ نیک و بد اور صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا، اس کے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی اور اس کو دیکھ دیکھ کر موجودہ مسلمانوں کی زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں وہ ان کے درست کرنے میں مشغول تھا اس نے پوری زندگی اس میں صرف کی کہ مسلم کی تصویرِ حیات کو اس شبیہہ کے مطابق بنا دے جو دین حق کے مرقع میں نظر آتی ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھی جبکہ تحریک خلافت نے نہ صرف عام مسلمانوں کو بلکہ بڑے بڑے علماء کو کانگریسی مسلک سے متفق کر دیا تھا اس مرد آخر میں کی نظر اس ہنگامہ آرائی کے ہولناک مناظر کو دیکھ رہی تھی اور چونکہ ع ''اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی'' اس لئے عین اس طوفانی دور میں آپ نے اپنی جان و عزت کی فکر کئے بغیر جو کچھ حق سمجھا اس کو برملا پیش کر دیا گویا اسکے صلے میں الزامات ملے، کسی نے انگریز کا پٹھو کہا کسی نے کہا کہ یہ تو مسلمانوں کے جذبۂ جہاد کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب اس کے باوجود آپ کو اپنے مسلک میں مستحکم پایا تو آزادی کا نعرہ بلند کرنے والوں نے اشرار کی جماعت تھانہ بھون میں بھیجی تا کہ اس زبان ہی کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جائے جس سے ان کے خلاف مرضی باتیں نکل رہی تھیں، یہ ٹکڑی آئی اور لاٹھیوں سے مسلح راستہ کے کنارے چھپ بیٹھی تا کہ صبح جب حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ مسجد جا رہے ہوں تو ان کا کام تمام کر دیا جائے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو

اس کی اطلاع ملی، آپ مراقب ہوئے، میلان قلبی یہی رہا کہ مسجد جایا جائے، حسب معمول ایک ہاتھ میں لالٹین اور ایک ہاتھ میں لاٹھی لئے ہوئے صبح صادق سے پہلے ہی گھر سے چل پڑے جب اس مقام پر پہنچے جہاں غنڈے چھپ بیٹھے تھے تو ان پر اس درجہ ہیبت طاری ہوئی کہ سب کے سب بے تحاشہ وہاں سے بھاگ پڑے اور پہلی ٹرین کے ذریعہ تھانہ بھون سے چلے گئے اور پھر کسی نے ایسی جرأت نہ کی۔

ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست
ہیبتِ ایں مرد صاحب دلق نیست

یہ سب کچھ ہوا لیکن جو اعتدال اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ گو آپ بہ حیثیت مجتہد اپنی رائے میں بہت متحکم تھے مگر چونکہ یہ مسئلہ بالکل اجتہادی تھا اس لئے خود اپنے حلقۂ ارادت کے علماء کو بھی اختلاف رائے کی پوری پوری آزادی دے رکھی تھی، البتہ جب بعض علماء نے حدود سے تجاوز کیا اور خود حضرت کو اپنی قائم کردہ رائے کے سامنے غلط ٹھہرانے کی کوشش کی اور اعتدال سے ہٹ گئے، تو حکیم الامت نے بھی ان کو اپنے زمرہ سے نکال دیا، بعد کو جب خلافت تحریک کی آندھی ختم ہوئی اور حکیم الامت کے محسوس کردہ خدشات حقائق بن کر سامنے آئے تو ان حضرات کی ندامت وخجالت بیان سے باہر رہی لیکن پھر نقصان کی تلافی نہ ہو سکی۔

اب اس اصولی اعلان متعلقہ جز پیش کیا جاتا ہے جو آپ نے ہندو مسلم اتحاد اور ترکِ موالات سے متعلق ۱۳۳۹ھ میں شائع فرمایا تھا۔

تحریکِ خلافت

تحریکات حاضرہ کا خلاصہ اس وقت دو امر ہیں (۱) تعاون جس کی نفی کا نام ترک موالات رکھا ہے اور دوسرا اتحاد ہندو مسلم:

امر اول (یعنی ترک موالات) کا درجۂ اول وہ نوکریاں یا وہ لین دین کی صورتیں ہیں جو دلائل شرعیہ سے فی نفسہا ناجائز ہیں اور ان کے ناجائز ہونے پر ہمیشہ علماء فتوی

دیتے چلے آئے ہیں۔ اور وہی فتویٰ اب بھی باقی ہے۔ مثلاً جن نوکریوں میں سود کی ڈگری دی جائے یا جس تجارت میں سود کا معاملہ ہو۔ اسی طرح وہ دوستانہ معاشرت جو خاص مسلمانوں ہی کا حق ہے یا وہ علوم وفنون حاصل کرنا جو دین میں مضر ہیں سو ان میں واقعات حاضرہ کو کچھ دخل نہیں اور نہ ان میں مسلم اور غیر مسلم میں کچھ تفاوت ہے ان سے اختلاف حال میں احتجاج کرنا درحقیقت غلط مبحث اور بالکل بے ربط و بے محل بات ہے۔

امر ثانی (ہندو مسلم اتحاد) کا درجہ اول وہ اتحاد ہے جس کا حاصل عدمِ نزاع ہے یعنی دونوں فریق حدود کے اندر رہ کر اپنے اپنے فرائض منصبی کو ادا کریں اور ایک دوسرے سے تعرض نہ کریں اور حقوق ہمسائیگی کی باہم رعایت رکھیں: سو یہ درجہ فی نفسہٖ جائز ہے اور اب بھی اسکے جواز میں کسی کا اختلاف نہیں۔''

امر اول (ترک موالات) کا دوسرا درجہ مباح، اجارات وتجارات وتعلیمات و استعانات وتعلقاتِ حاکمیت ومحکومیت کے ہیں۔

امر ثانی (ہندو مسلم اتحاد) کا دوسرا درجہ وہ اتحاد ہے جس کی غرض ہندوستان کے لئے آزاد حکومت کا حاصل کرنا ہے اس وقت علماء وعقلاء کا انہیں دو درجوں میں اختلاف ہے پس بعضے تعاون کے اس درجہ کو جائز اور اتحاد کے اس درجہ کو ناجائز کہتے ہیں یہ تحقیق ہے محل اختلاف کی، اب اس اختلاف کی حقیقت دنیا سمجھے، یہ تعاون یا اتحاد شرعاً فی نفسہٖ نہ واجب ہے نہ حرام۔ شرعاً امور مباحثہ سے ہے، چنانچہ اہل علم پر ظاہر ہے، یہاں تک تو کوئی اختلاف نہیں آگے بعض کی نظر تو اس عدم تعاون مع الحکومت اور اتحاد مع الہنود کے مصالح ومنافع ضروری التحصیل فی زعمھم (یعنی وہ مصلحتیں جو ان کے زعم میں ضروری تھیں) پر پڑی اور وہ ''خلافت کمیٹی'' والے ہیں۔ ان عوارض پر نظر کر کے انہوں نے ان دونوں امر کو واجب و جائز کہا۔ اور بعض کی نظر اس عدم تعاون اور اتحاد کے مفار ومفاسد دینیہ حالیہ و مالیہ ضروری الاجتناب (یعنی موجودہ و آئندہ قابلِ ترک برائیوں) پر پڑی جن کی تفصیل خاص خاص تحریرات میں شائع بھی ہو چکی ہے۔ ان عوارض پر نظر کر کے

انہوں نے ان دونوں امر کو ممنوع کہا، اور احقر کی بھی یہی رائے ہے اور اسی بنا پر بیان اول میں اس کو فتنہ کہا تھا، یہ حقیقت اور بنا ہے اس اختلاف کی، اب اس سے امور ذیل معلوم ہو گئے ہوں گے۔

(ایہہ کہ اس اختلاف کی دونوں شقیں قطعی نہیں ہیں)۔ظنی اجتہادی ہیں۔ پس ان میں اختلاف کی گنجائش ہے، گو کوئی چھوٹے درجہ کا طالب علم بھی کسی بڑے عالم کے ساتھ اختلاف کرے محض اختلاف سے کسی فریق کو دوسرے فریق پر لعن طعن یا سب وشتم یا لعنت و ملامت یا تضلیل و تجہیل یا تفسیق و تکفیر یا جبر و تشدد و ظلم و ایذا یا بقول یا بالعمل کسی بزرگ کا اس کا مخالف و بے ادب مشہور کر کے بدنام کرنا جائز نہیں (بحکم مقدمہ نمبر۱) البتہ منکرات شرعیہ پر انکار یا تقبیح واجب ہے اور اس میں کسی مسلمان کا اختلاف نہیں بعض واقعات وعوارض کا اختلاف ہے جس کی شرعی مثالیں (مقدمہ۲) میں مذکور ہو چکی ہیں اور ایک عرفی مثال اور معروض ہے اختلاف دلائل کی، مثال دو یونانی متحد الاصول طبیبوں کا اختلاف اس مریض کے باب میں ہے جو کمزور بھی ہے اور اس میں کسی مادہ فاسدہ کا بھی غلبہ ہے۔ ایک طبیب نے اس پر نظر کی جب تک مادہ کا تنقیہ نہ کیا جائے گا قوت نہ آوے گی اس لئے مسہل تجویز کر دیا، دوسرے طبیب نے اس پر نظر کی کہ جب تک قوت کی بقال تدبیر نہ کی جاوے گی مسہل ہی کا متحمل نہ ہو گا اس لئے مسہل کو منع کیا اب یہ دونوں اس پر متفق ہیں کہ مادہ کا تنقیہ بھی ضروری ہے اور قوت کا تحفظ بھی ضروری ہے مگر پھر بھی عوارض کے سبب دونوں کی رائے میں اختلاف ہو گیا، پس اختلاف ان دونوں مسئلوں کا اسی قبیل سے ہے کہ منافع ومضار پر نظر پڑنا اس کا باعث ہو گیا۔

"تیسرا امر یہ معلوم ہوا کہ اس عدم تعاون کا نام جو بعض نے ترک موالات رکھ لیا ہے اس عنوان سے اس کا حکم جو اوپر مذکور ہوا بدل نہ جائے گا (بحکم مقدمہ۳) جیسا کہ بعض نے یہ ترکیب رکھی ہے کہ قرآن مجید میں جو موالات کی ممانعت کی آیتیں آئی ہیں۔ اس عدم تعاون کو اس میں داخل کر کے اختلاف کرنے والے فریق کو قرآن کا مخالف بتا کر

عوام الناس کو اس سے متوحش و متنفر کرتے ہیں جس طرح عاملین مولد نے اپنی مجلس متعارفہ کا نام مجلس ذکر رسول ﷺ اور قیام کا نام تعظیم رسول ﷺ رکھ کر اہلِ حق کی طرف سے عوام کو بدگمان کر دیا کہ ذکر و تعظیم رسول ﷺ سے منع کرتے ہیں۔ یا امتناع و امکان کے مسئلہ میں اس طرح بدنام کیا کہ یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ جھوٹ بھی بول سکتا ہے، پس ایسے ہی اصطلاحِ ترک موالات سے کام لیا جا رہا ہے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کوئی نام رکھ دینے سے حقیقت نہ بدل جائے گی اس لئے حکم بھی نہ بدلے گا۔ باقی ایسی ترکیب سے کام لینا اہلِ علم کے شان کے بالکل خلاف ہے میں نے اپنے نزدیک ان مسائل اور اس اختلاف اور اپنے مسلک کی حقیقت بالکل صاف کر دی ہے اگر اس پر بھی بدنام کرنے کا شوق ہو تو اس سے زیادہ نہ کہوں گا کہ فصبر جمیل واللہ المستعان علی ما تصفون۔

والسلام

(احقر اشرف علی۔ تھانہ بھون جمادی الاول ۱۳۳۹ھ)

لیگ و کانگریس

اس لاجواب اعلان کے بعد حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ پر اوچھے وار کئے گئے۔ لیکن قدرت نے ان سب کی مدافعت کی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ آپ کی کہی ہوئی بات پتھر کی لکیر نکلی اور خلافت تحریک کے نتیجہ میں مسلمانوں کو حرماں نصیبی اور پریشانی اور بعض صورتوں میں بے دینی کا منہ تک دیکھنا پڑا۔ لیکن اب تو کانگریسی مسلمان عوام اور علماء کا غیض و غضب اور بھی بڑھ گیا اور حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کو ابتداءً انگریزوں کا کارندہ اور پھر مسلم لیگ کا کٹر حامی سمجھا جانے لگا۔ اور آج بھی بعض نہ جاننے والے حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی مسلک کی نزاکت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے آپ کو ''لیگ'' کا ایسا ہی حامی سمجھتے ہیں جیسا کہ اس کے باضابطہ اراکین تھے، ذیل میں آپ کا ایک اور جامع بیان درج ہے جس سے آپ کے مسلک کی پوری پوری طرح وضاحت ہوتی ہے اور حمایت لیگ کے حدود کی تعین ہو جاتی ہے یہ ایک صاحب کے استفسار کا جواب ہے جس کو ''تنظیم المسلمین'' کے

نام سے موسوم فرمایا ہے:

"قال اللّٰہ تعالیٰ "واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعا ولا تفرقوا الآیة بعد الحمد والصلوٰۃ احقر اشرف علی مدعا نگار ہے کہ سب کو معلوم ہے کہ آج کل ہندوستان میں مفاد ملکی کے نام سے ایسی سیاسی جماعتیں جو تنظیم وتعمیم کی جامع ہوں دو ہیں۔ایک کانگریس، دوسری مسلم لیگ، اور دونوں اپنی اپنی طرف شرکت کی دعوت دیتی ہیں اور نافعیت میں ایک دوسرے پر ترجیح دیتی ہیں اہلِ رائے اختلاف رکھتے ہیں اور اسی کی تحقیق کے لئے مدت سے متر ددین کی طرف سے شرکت کے متعلق مختلف عنوانات سے سوالات کا سلسلہ جاری ہے اب تک چونکہ دونوں کے واقعات کا کافی علم نہ تھا اس لئے جواب کی بنا زیادہ تر سائلین کے بیان پر ہوتی تھی اور احیاناً جواب کے کچھ حصہ میں ثقات کی روایات کو بھی کچھ دخل ہوتا تھا۔اور بعض اوقات بغرض مزید تحقیق، خود سائل سے بھی واقعات کی تنقیح کی جاتی تھی، اور ان بناؤں کے اختلافات سے مختتم جواب نہ ہوسکتا تھا جس سے ممکن ہے کہ سائل کو شفائے تام نہ ہوتی ہو اور اس صورت میں یقیناً ایسے جوابوں سے طریق عمل کا اخذ کرنا جو سوال سے اصل مقصود تھا دشواری سے خالی نہ تھا، اس لئے سخت ضرورت تھی کہ واقعات کی مزید تعین وتحقیق کی جائے جس کے لئے مختلف ذرائع اختیار کرنا ممکن ہوگیا۔اور آج آپ کا خط اس جواب کے پیش کرنے کا محرک ہوگیا۔

حمایت لیگ کے حدود

یہ چند سطریں اسی جواب کی حکایت ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ اس میں تو کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ فضائے حاضر میں مسلمان کو شدید استحکام کے ساتھ منظم ہونے کی سخت ضرورت ہے اور ان کے تمام منافع اور مصالح کی حفاظت اور تمام مضار ومفاسد سے صیانت اسی تنظیم پر موقوف ہے، مگر اس کے ساتھ ہی ہر مسلمان پر یہ بھی واجب التسلیم و عمل ہے کہ وہ تنظیم حسب قدرت بالکل احکام شرعیہ کے موافق ہو (جو آیتِ پیشانی میں "اعتصام بحبل اللہ" کی لا تفرقوا" پر تقدیم سے بھی ظاہر ہے) سو اگر اس وقت

ملک میں اس صفت کی کوئی جماعت موجود ہوتی یا اس کا ہونا متوقع قریب ہوتا تو جواب واضح تھا لیکن موجودہ حالت میں افسوس اور نہایت افسوس کہ ایسی جماعت کا نہ تحقق ہے نہ قریب میں توقع، اس لئے بجز اس کے چارۂ کار نہیں کہ موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور اس میں قواعد شرعیہ کی رو سے جو نقص ہو اس کی اصلاح کریں۔ اور اگر ان میں ایک کی اصلاح آسان اور دوسرے کی دشوار ہو تو یہ قاعدۂ عقلیہ و نقلیہ من ابتلی ببلتین فلیختر وھونھا (جس کا ماخذ کثیرہ میں سے ایک ماخذ، حدیث بریرہ میں یہ ارشاد نبوی ﷺ ہے اعتقیھا و اشترطی لھم الولاء علی ما قررہ النوادی فی الشرح لصحیح مسلم) اس میں داخل ہو جائیں جس کی اصلاح آسان ہو۔ سواسکے متعلق جہاں تک تفحص بلیغ کے ساتھ تحقیق کیا گیا مذکورہ و مسئولہ دونوں جماعتوں میں ان کی موجودہ حالت پر نظر کر کے مسلم لیگ کے نقائص کا رفع کرنا سہل ہے اور کانگریس کی اصلاح متعسر (زیادہ مشکل) بلکہ متعذر ہے جس کے وجوہ کا خلاصہ وہی ہے جو آپ نے لکھا ہے کہ مسلم لیگ خالص کلمہ گویوں کی جماعت ہے اور کانگریس میں عنصر غیر مسلمین کا ہے اور جو شخص اسلام کو حق جانتا ہو اس کو شریعت کے قریب لانا بہ نسبت اس کے جو اسلام کو حق نہیں جانتا ظاہر ہے کہ سہل ہے۔ نیز مسلم لیگ کے اعلانات جیسے لیگ کا مینیو فیسٹو وغیرہ اور کانگریس کے معاملات اس کے شاہد ہیں رسالہ ''آزادی جنگ کو جس کا آپ نے سوال میں حوالہ دیا ہے، میں نے بھی دیکھا ہے واقعی اس میں ان معاملات کی تفصیل اچھی طرح دی گئی ہے۔ منصف مزاج کے لئے اس کا مطالعہ میرے خیال میں کافی ہے۔ پس اس اصل کی بناء پر شرح صدر کے ساتھ میری یہ رائے قائم ہوئی کہ مسلمانوں کو اطمینان و توکل کے ساتھ مسلم لیگ میں داخل ہونا چاہئے۔ پھر ان میں جو اہلِ قوت ہوں وہ اہلِ قوت کو وقتاً فوقتاً یاددہانی کر کے تقاضے کے ساتھ ان سے اصلاحِ مطلوب کی درخواست کرتے رہیں اور اصلاح کے طریقوں میں علماء و محققین سے مدد لیتے رہیں۔ جو علماء اس میں شریک ہوں ان سے تو علمی و عملی دونوں

امداد حاصل کریں اور جو اس میں کسی مصلحت یا عذر سے باضابطہ شریک نہ ہوں ان سے صرف علمی مدد لیں یعنی ان سے واقعات ظاہر کر کے احکامِ شرعیہ معلوم کرتے رہیں اور ان کے موافق مسلم لیگ کی حالت کو درست کرتے رہیں اور مسلم لیگ جو معاملات پیش آئیں ان کے متعلق اگر علماء میں اختلاف ہو تو جو علماء کسی جماعت میں باضابطہ شریک نہ ہوں ان سے استفسار کیا جائے اور ان میں بھی اگر اختلاف ہو تو شرعاً دونوں شقوں میں گنجائش سمجھی جائے اور دونوں شقوں میں سے مدبروں کے نزدیک جو مصلحت ہو اس پر عمل کیا جائے اور جو علماء کسی جماعت میں شریک نہ ہوں وہ بھی بیکار نہ رہیں بلکہ وہ اس سے اہم خدمت میں مشغول رہیں اور وہ خدمت بندگان خدا کو احکام شرعیہ کی تعلیم وترغیب دینے کی ہے جو مشترک طریقہ ہے۔ حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا بلکہ پہلی قسم کے علماء کو بھی جتنا وقت مسلم لیگ کی خدمت سے بچے اس اشاعت احکام میں حصہ لینا ضروری ہے۔ پس اس تفصیل سے بقاعدہ تقسیم عمل (جو آیت وما کان المومنون لینفروا کافة فلو لا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقه فی الدین سے بھی ماخوذ ہے) سب کو اپنے کام میں مشغول ہونا چاہئے، پھر اس کے بعد انشاءاللہ تعالیٰ وعدہ الٰہی ان اللّٰہ لا یضیع اجر المحسنین (سورہ ہود) وانا لا نضیع اجر المصلحین (سورہ اعراف) کا ظہور ہوگا اور اس کی بھی ضرورت ہے کہ یہ ہیت مذکورہ اس تنظیم کو ہمیشہ ہمیشہ مستقلاً جاری و باقی رکھیں کیونکہ اس کے ثمرہ کی تو ہمیشہ ہی حاجت ہے یہ تو خلاصہ ہے اپنے انتظام کا، باقی دوسروں کے ساتھ معاملہ سو انتظام کے بعد اگر کانگریس مسلم لیگ سے صلح کی طرف مائل ہو تو حسب ارشاد وان جنحوا لسلم فاجنح لها اس سے اصولِ شرعیہ کے موافق تنقیط وتدبر کے ساتھ اہل تجربہ و اہل علم و اہلِ فہم کے مشورہ سے صلح رکھیں مگر اپنی تنظیم مذکور کو اس وقت بھی قوت و استقلال کے ساتھ قائم رکھیں اس کو کمزور نہ کریں، نہ کانگریس میں مدغم کریں۔ کہ یہ شرع اور تجربہ دونوں کے اعتبار سے نہایت مضر ہے۔ اور بالفرض اگر مسلم لیگ کی اصلاح کے قبل یا بعد

اور کوئی جماعت مسلمہ منظمہ صاحب قوت وصاحب اثر تیار ہو جائے اس صورت میں مسلم لیگ اور وہ جماعت دونوں اتحاد و اشتراک کے ساتھ کام کریں تا کہ مسلمانوں میں افتراق وتشتت نہ ہو اور ان سب حالات میں قولاً وفعلاً وحالاً وتقریراً موافق ومخالف ہر ایک کے ساتھ اخلاق اسلامی کو اپنا شعار رکھیں، جب ارشاد ہے وقل لعبادی یقولو االتی ھی احسن و غیرھا من الآیات، خلاصہ دستور العمل یہ ہے کہ از خود نہ کسی سے آویزش کی ضرورت نہ آمیزش کی ضرورت، رضائے حق کو مطمح نظر رکھ کر اپنے کام میں لگے رہیں اور اس رضا کی شرط یہ ہے کہ ہر کام میں اس کا پورا لحاظ رکھیں کہ کوئی امر خلاف شرع نہ ہونے پائے، یہی عبدیت کی روح ہے اور حیات مسلم کی اصل الاصول ہے اور اس استقلال واستقامت کے ساتھ ہی دعا وابتہال کو اصل وظیفہ وتدبیر سمجھیں اور پھر نصرتِ حق کے منتظر رہیں، اب اس تحریر کو بزرگوں کی ایک نافع وصیت اور دو جامع دعاؤں پر ختم کرتا ہوں، یہ دعائیں بھی ورد رکھنے کے قابل ہیں خصوصاً بعد نماز۔

وصیت

کار کن کار بگذر از گفتار　　　کار ندریں راہ کار باید کار

دعائے اول

اللّٰھم ارناالحق حقا و ارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنا به

دعائے ثانی

اللّٰھم النصر من نصر دین محمد صلی اللّٰہ علیه وسلم واجعلنا منھم واحذل من حذل دین محمد صلی اللّٰہ علیه وسلم ولا تجعلنا منھم''

نوٹ: نمبرا اس جواب میں میں نے اپنے مزید اطمینان کے واسطے احتیاطاً اپنی جماعت کے متعدد ومحقق علماء سے بھی مشورہ کرلیا ہے ان سب نے بھی اس سے اپنی موافقت کا اظہار فرمایا۔

نمبر۲: یہ جواب مسلم لیگ کی موجودہ حالت پر ہے اگر خدانخواستہ حالات بدل جائیں تو حکم بھی بدل جائے گا۔

نمبر۳: جو صاحب اس مضمون کو شائع کرنا چاہیں وہ اس کا خلاصہ شائع نہ کریں بلکہ بجنسہٖ پورا مضمون شائع کریں، خلاصہ کرنے میں بہت سی فروگزاشتیں اور نیز غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں اور اگر کسی کو کسی کے شائع کردہ مضمون میں کچھ کمی بیشی کا شبہ ہو تو تھانہ بھون کے ماہوار رسالہ "النور" بابتہ ماہ ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ سے مقابلہ کرلیں کہ اس رسالہ میں میرا یہ مضمون بعینہٖ پورا چھپا ہے۔ والسلام خیر ختام:

مقام تھانہ بھون ۔ ۹ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۰ فروری ۱۹۳۸ء

لیگ و کانگریس کی مثال

تفصیلی بیان آپ کے پیش نظر آچکا، اب حضرت کا ایک ملفوظ سنئے چند جملوں میں لیگ و کانگریس کا موازنہ فرمایا ہے اور حمایت مسلم لیگ کی وجہ بتائی ہے یہ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء کا ارشاد ہے:

"میں نے جو اعلان شائع کیا ہے اس میں مسلم لیگ کی حمایت کی ہے مگر صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں قابلِ اصلاح بلکہ واجب الاصلاح ہیں۔ ہاں مسلم لیگ نسبتاً کانگریس سے اچھی اور بہت اچھی ہے لہٰذا اس میں اصلاح اور درستی کی نیت سے شریک ہونا چاہیے۔ میں کانگریس کو اندھے کے مشابہ سمجھتا ہوں اور مسلم لیگ کو کانے کے مشابہ اور ظاہر ہے کہ اندھے کو کانے پر ترجیح ہوگی۔ مثلاً اگر کسی کو نوکر رکھنے کی ضرورت ہو اور اتفاقاً دو نوکر ملیں ایک اندھا، ایک کانا، اب فرمایئے وہ کس کو نوکر رکھے گا، اندھے کو یا کانے کو؟ یقیناً کانے ہی کو رکھے گا، بس اسی بنا پر میں مسلم لیگ کا حامی ہوں۔" (ملفوظات: اسعد الابرار)

مومن کانفرس

حکیم الامت کی بصیرت و تدبر کا ایک اور اہم واقعہ نقل کر کے اس عنوان کو ختم کیا جائے گا۔ ستمبر ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے، کانپور میں "مومن کانفرنس" ہو رہی تھی اور ان لوگوں اور دوسرے مسلمانوں میں زیادہ کشیدگی پیدا ہو گئی تھی یہاں تک کہ مومن صاحبان میں سے ایک شخص قتل بھی ہوا تھا، غرض اس خلفشار کی حالت میں انہی دنوں حکیم الامت کا بھی

کانپور آنا ہوا، لوگوں کی درخواست پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مصالحتی بیان شائع کیا جس سے فضا صاف ہوگئی، اس بیان کو غور سے پڑھئے اور دیکھئے کہ یہ کس قدر بے لاگ اور ساتھ ہی مصالحانہ بھی ہے۔

''الاختلاف للاعتراف''

بعد الحمد والصلوۃ

مجھ سے مختلف مسلمان اقوام کے متعلق جن میں بعض قومیں دوسری قوموں کی تنقیص وتحقیر کرتی ہیں اور بعض قوموں میں اپنے کو بلا دلیل دوسری قوموں میں داخل کرتی ہیں، پوچھا گیا کہ یہ دونوں فعل شرعی قاعدے سے کیسے ہیں؟

اس کا جواب عرض کرتا ہوں کہ یہ دونوں فعل شرعاً قبیح ہیں، پہلا تفریط ہے اور دوسرا افراط، تفصیل اس کی یہ ہے کہ نصوص شرعیہ اس باب میں ظاہراً دو قسم کے ہیں، ایک مثبت، مساوات وتماثل، ایک مثبت تفاوت وتفاضل، چنانچہ حدیث جاننے والوں کو معلوم ہے، اور ظاہر ہے کہ نصوص میں تعارض نہیں ہوسکتا، لہذا دونوں کے لئے جدا جدا محمل قرار دیا جائے گا۔ پس نصوص مساوات تو احکام متعلقہ آخرت کے باب میں ہیں، یعنی آخرت کی نجات کے لئے ایمان و اعمال صالحہ کے مدار ہونے میں سب برابر ہیں، اسی طرح اسلامی حقوق میں اور دینی کمال حاصل کرنے کے بعد تقدم میں سب برابر ہیں مثلاً سلام وتشمیت عاطس وعبادت وشہودِ جنازہ میں کہ حقوق اسلامیہ ہیں، یا تحصیل اوصافِ استحقاقِ امامت کے بعد، یا تحصیل علوم دینیہ کے بعد، یا تحصیل کمالات باطنیہ کے بعد، امام یا استاد یا شیخ بنانے کے استحقاق میں سب برابر ہیں، چنانچہ مدعیانِ شرافتِ عرفیہ بھی سب قوموں کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں، ان سے علوم حاصل کرتے ہیں، ان سے بیعت ہوتے ہیں، ان کو بطور خلافت طریق بیعت وتلقین کی اجازت دیتے ہیں، چنانچہ خود احقر ایسے حضرات کا شاگرد بھی ہے اور بعضے میری طرف سے مجاز طریقت بھی ہیں، پس نصوصِ مساوات کا تو یہ محمل ہے اور نصوصِ تفاوت احکام راجعہ الی المصالح الدنیویہ کے باب میں ہیں جیسے شرفِ نسب یا نکاح میں کفاءت! حتیٰ کہ جو اقوام عرفاً اعلیٰ طبقہ کی مشہور ہیں خود ان میں بھی باہمدگر اس تفاوت کا شرعاً اعتبار کیا گیا ہے، قریش میں بنی ہاشم کا شرفِ نسبی بقیہ قریش پر نص میں وارد ہے۔ کفاءت میں قریش کا شرف غیر قریش پر گو وہ بھی عربی

ہوں دلائل شرعیہ سے ثابت ہے، اب نصوص میں کوئی تعارض نہیں۔ پس اس تفاضل کے یہ معنی نہیں کہ کوئی قوم اپنے کو بڑا سمجھ کر دوسرے کو حقیر سمجھے بلکہ صرف بعض احکام میں جن کا بیان اوپر گذر چکا اس تفاضل پر عمل کی اجازت ہے، پس جو لوگ اپنے کو بڑا اور دوسروں کو اعتقاداً یا عملاً حقیر سمجھتے ہیں یا بلا دلیل شرعی بڑی قوموں میں داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں، یہ دونوں، افراط وتفریط میں مبتلا ہیں۔ پہلی جماعت کا تکبر تو کھلا ہوا ہے کہ دوسروں کو علانیہ حقیر سمجھا، مگر دوسری جماعت والے بھی عند التامل تکبر کا ارتکاب کر رہے ہیں کیونکہ جب ایک قوم سے نکل کر بلا دلیلِ شرعی دوسری قوم میں داخل ہونے کی کوشش کی تو جس قوم سے نکلنا چاہا ہے اس کو حقیر سمجھا ورنہ اس سے نکلنے کی کوشش کیوں کرتے اور علاوہ تکبر کے نسب کے بدلنے کے گناہ کا بھی ارتکاب کرتے ہیں جس پر حدیث میں سخت وعید وارد ہے۔ بہر حال ان احکام کے علم کے بعد دونوں جماعتوں پر واجب ہے کہ افراط وتفریط سے توبہ کر کے اتباعِ نصوص کے تحت میں حدودِ شرعیہ کے اندر رہیں اور باہم ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ رکھیں اور کمالات دینیہ حاصل کریں کہ اصلی شرف یہی ہے ورنہ دوسرے اسباب شرف آخرت میں نافع نہ ہونگے جو کہ مسلمان کا اصل مقصود ہے۔ واللہ الموافق۔ اور یہ سب مضمون آیت "یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثی. الی قولہ تعالیٰ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" میں مذکور ہے، احکامِ آخرت میں مساوات تو صراحتاً فی قولہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم"۔ پس تقویٰ کے مدارِ کرمیت ہونے میں سب مساوی ہیں اور احکام دینویہ میں تفاوت قریب بہ صراحت فی قولہ تعالیٰ "وجعلنا کم شعوب و قبائل لتعارفوا" تقریر دلالت یہ ہے کہ اختلاف شعوب وقبائل کی غایت تعارف وتمائز کو فرمایا اور ظاہر ہے کہ تعارف وتمائز احکام دنیویہ میں سے ہے اور خود مقصود بالذات نہیں بلکہ ادائے حقوق خاصہ کے لئے ہے اور جو حقوق تعارف وتمائز پر متفرع ہوتے ہیں وہ سب احکام متعلقہ بالمصالح الدنیویہ ہیں، پس اس طرح پر دلالت حاصل ہوگئی۔ وللہ الحمد علی ما علم وفھم وھدانا الی الطریق الاقوام فقط ۱۶ رجب ۱۳۵۷ھ۔

کتبہ بقلمہ اشرف علی عفی عنہ فی کانپور الغد من انعقاد مومن کانفرنس

۱۶ رجب ۱۳۵۷ھ (از ارمغانِ جاودان)

وصیتیں

کسی کوچ کرنے والے کے آخری کلمات گویا اسکی تجرباتی زندگی کا حاصل اور اسکے جذبات واحساساتِ قلبی کی صحیح ترین تصویر اور اسکی خیراندیشی کا اعلیٰ ترین مرقع ہوتے ہیں اسلئے اس شخص کے مسلک کی بہترین ترجمانی انہی وصیتوں سے ہوسکتی ہے پس ہم حکیم الامت قدس سرہٗ کی وصیتوں کے وہ اجزا جن کا تعلق عام مسلمانوں کی صلاح وفلاح سے ہے ذیل میں درج کرتے ہیں جن سے اس مردِ درویش شیخ شفیق عارف کامل حکیم الامت اور مجدد وقت کا مسلک بلکہ سارے مسلک کی روح اور اسکا مدار واضح ہوجاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

(۱) میں اپنے دوستوں سے استدعا کرتا ہوں کہ میرے سب معاصی صغیرہ وکبیرہ، عمد وخطا کے لئے استغفار فرمائیں اور جو میرے اندر عادات واخلاق ذمیمہ ہیں ان کے ازالہ کی دعا کریں۔

(۲) میرے بعض اخلاق سیۂ کے سبب بعض بندگانِ خدا کو حاضرانہ وغائبانہ میری زبان و ہاتھ سے کچھ کلفتیں پہنچی ہیں اور کچھ حقوق ضائع ہوئے ہیں خواہ اہل حقوق کو اس کی اطلاع ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو میں نہایت عاجزی سے سب چھوٹے بڑوں سے استدعا کرتا ہوں کہ للہ دل سے ان کو معاف فرمادیویں اللہ تعالیٰ ان کی تقصیرات سے درگذر فرماویں گے میں بھی ان کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو دارین میں عفو وعافیت عطا فرماویں۔ معذرت کرنے والے کی تقصیر سے درگذر کی بڑی فضیلت آئی ہے اگر معاف کرنے کی ہمت نہ ہو تو حسبِ فتویٰ شرعی مجھ سے عوض لے لیں، خدا کے لئے قیامت پر مواخذہ نہ رکھیں کہ اس کا کسی طرح تحمل نہیں۔

(۳) اس قبیل کی کوتاہیاں جو دوسروں سے میرے حق میں ہوگئی ہوں بطیّب خاطر گزشتہ اور

آئندہ کے لئے محض خدائے تعالیٰ کے راضی کرنے کو اور اپنے خطاؤں کے معافی کی توقع پر وہ سب معاف کرتا ہوں۔

(۴) چونکہ محبت میں اکثر مدائح غیر واقعیہ مشہور کردیئے جاتے ہیں اسلئے میں اپنی سوانح لکھا جانا پسند نہیں کرتا اگر کسی کو بہت ہی بیتابی کا شوق ہو اور دوسرے اہلِ تدین و تحقیق بھی اجازت دیں تو روایت میں احتیاطِ شدید کو واجب سمجھنا چاہئے ورنہ میں بری ہوتا ہوں۔

(۵) تالیفات کے بعض مقامات میں مجھ سے اختصار موہم یا زیادات موہمہ یا غفلت سے کچھ لغزشیں بھی ہوئی ہیں جو اس وقت ذہن میں حاضر ہیں اس کی اطلاع جزوی طور پر دیتا ہوں[1] اور جو اس وقت ذہن میں حاضر نہیں ان کے لئے دو قاعدے عرض کرتا ہوں ایک یہ کہ میری کسی تصنیف میں جو اس محل لغزش سے متاخر ہو اس کی اصلاح کردی گئی ہو۔ اور متاخر ہونا تاریخ کے ملانے سے جو کہ ہر تصنیف کے آخر میں التزاماً لکھی گئی ہے معلوم ہوسکتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم کرلینا چاہئے کہ میری تالیفات میں جو مضمون متعارض ہو اس میں آخر کا قول میرا سمجھا جائے دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ ایسے مواقع مشتبہ کو دوسرے علمائے محققین سے تحقیق کرلیا جائے اور ان کے قول کو میرے قول پر ترجیح دی جائے۔ اسی طرح اگر میرا لکھا ہوا کوئی مشتبہ فتویٰ کسی کی نظر سے گذرے اس میں بھی یہی تقریر معروض ہے کیونکہ بعض اوقات لکھنے کے بعد خود مجھ کو بعض جوابوں کا غلط ہونا محقق ہوا ہے میں نے سائل کا پتہ معلوم ہونے پر اس کو مطلع بھی کردیا ہے لیکن پتہ نہ معلوم ہونے کی صورت میں یا اس سائل کے پاس میری تصحیح کے محفوظ نہ رہنے کی تقدیر پر احتمال غلطی میں پڑنے کا ہوسکتا ہے۔ اس لئے احتیاطاً یہ عرض کیا گیا۔

(۶) میری تحریرات میں جو مضامین از قبیل، علوم مکاشفہ ہیں جو کہ علم تصوف کی ایک قسم ہے جس کو حقائق و معارف سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور جِ شرعیہ ان سے ساکت ہیں ان کو حسب قاعدہ اصولیہ و کلامیہ امور ثابتہ بدلائلِ شرعیہ کے درجہ میں نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ بالکل اعتقاد نہ رکھنا بھی

---

[1] اس کی تفصیل اشرف السوانح ج (۳) میں دیکھو!

جائز ہے اور اگر اعتقاد رکھے تو محض احتمال کے درجہ سے تجاوز نہ کرے۔

(۷) میں اپنے دوستوں کو خصوصاً اور سب مسلمانوں کو عموماً بہت تاکید کے ساتھ کہتا ہوں کہ علم دین کا خود سیکھنا اور اولاد کو تعلیم کرانا ہر شخص پر فرض عین ہے خواہ بذریعہ کتاب ہو یا بذریعہ صحبت، بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ فتنِ دینیہ سے حفاظت ہو سکے جن کی آج کل بیحد کثرت ہے اس میں ہرگز غفلت یا کوتاہی نہ کریں۔

(۸) دینی یا دنیوی مضرتوں پر نظر کر کے ان امور سے خصوصیت کے ساتھ احتیاط رکھنے کا مشورہ دیتا ہوں (ا) شہوت وغضب کے مقتضا پر عمل نہ کریں (ب) تعجیل نہایت بری چیز ہے۔ (ج) بے مشورہ کوئی کام نہ کریں۔ (د) غیبت قطعاً چھوڑ دیں (ر) کثرت کلام اگرچہ مباح کے ساتھ ہو اور کثرت اختلاطِ خلق بلا ضرورت شدیدہ و بلا مصلحت مطلوبہ اور خصوصاً جب کہ دوستی کے درجہ تک پہنچ جائے پھر خصوص جب کہ ہر کس وناکس کو راز دار بھی بنالیا جائے، نہایت مضر چیز ہے (ڑ) بدون پوری رغبت کے کھانا ہرگز نہ کھایا جائے (ز) بدون سخت تقاضے کے ہم بستر نہ ہوں (س) بدون سخت حاجت کے قرض نہ لیں (ص) فضول خرچی کے پاس نہ جائیں (ط) غیر ضروری سامان جمع نہ کریں (ع) سخت مزاجی اور تند خوی کی عادت نہ کریں اور ضبط وتحمل کو اپنا شعار بنائیں (ف) ریا وتکلف سے بہت بچیں، اقوال وافعال میں بھی طعام ولباس میں بھی (ق) مقتداء کو چاہئے کہ امراء سے نہ بد خلقی کرے اور نہ زیادہ اختلاط کرے اور نہ ان کو حتی الامکان مقصود بنادے، بالخصوص دنیوی نفع حاصل کرنے کے لئے (ک) معاملات کی صفائی کو دیانات سے بھی زیادہ مہتم بالشان سمجھیں (گ) روایات وحکایات میں بے انتہا احتیاط کریں اس میں بڑے بڑے دیندار اور فہیم لوگ بے احتیاطی کرتے ہیں خواہ سمجھنے میں خواہ نقل میں (ل) بلا ضرورت بالکلیہ اور ضرورت میں بلا اجازت وتجویز طبیب حاذق وشفیق کے کسی قسم کی دوا ہرگز استعمال نہ کریں (م) زبان کی، غایت درجہ ہر قسم کی معصیت ولایعنی سے احتیاط رکھیں (ن) حق پرست رہیں، اپنے قول پر جمود نہ کریں (و) تعلقات نہ

بڑھائیں (ہ) کسی کے دنیوی معاملات میں دخل نہ دیں۔

حتی الامکان دنیا و مافیہا سے جی نہ لگائیں اور کسی وقت فکر آخرت سے غافل نہ ہوں ہمیشہ ایسی حالت میں رہیں کہ اگر اسی وقت پیام اجل آجائے تو فکر اس تمنا کا مقتضی نہ ہو **لو لا اخرتنی الی اجل قریب فاصدق و اکن من الصالحین** ۔ اور ہر وقت یہ سمجھیں ع ''شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود'' اور علی الدوام دن کے گناہوں سے قبل رات کے اور رات کے گناہوں سے قبل دن کے استغفار کرتے رہیں اور حتی الوسع حقوق العباد سے سبکدوش رہیں۔

میں اپنے منتسبین سے درخواست کرتا ہوں کہ ہر شخص اپنی عمر بھر یاد کر کے سورۂ یٰسین شریف یا تین بار قل ہو اللہ شریف پڑھ کر مجھ کو بخش دیا کرے مگر اور کوئی امر خلاف سنت، بدعت عوام و خواص میں سے نہ کرے۔

میرے ایصال ثواب کے لئے کبھی جمع نہ ہوں نہ اہتمام سے نہ بلا اہتمام۔ اگر کسی دوسرے اتفاق سے بھی جمع ہو جاویں تو تلاوت وغیرہ کے وقت قصداً متفرق ہو جاویں۔ اور ہر شخص متفرداً بطور خود جس کا دل چاہے دعا و صدقہ و عبادتِ نافلہ سے نفع پہنچاوے نیز میری مستعمل چیزوں کے ساتھ تعارف طریق سے تبرکات کا سا معاملہ نہ کریں البتہ اگر کوئی محبت سے شرعی طریق سے اس کا مالک بن کر مخفی طور پر اپنے پاس رکھے مضائقہ نہیں اس کا اعلان اور دوسروں کے دکھلانے کا اہتمام نہ کیا جائے۔

خاتمہ بالخیر ہونے کو تمام نعمتوں سے افضل و اکمل اعتماد رکھیں اور ہمیشہ خصوصاً پانچوں نماز کے وقت نہایت لجاجت و تضرع سے اس کی دعا کیا کریں اور ایمان حاصل پر شکر کیا کریں کہ حسب وعدہ **لئن شکرتم لازیدنکم** یہ بھی اعظم اسباب ختم بالخیر سے ہے اور اسی کے ساتھ میں اپنے بھی اس دعا کیلئے درخواست کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرا بھی ایمان پر خاتمہ فرمائے۔

باری تعالیٰ اس راقم ہیچ مدان کو اور احقر عبد المنان کو اور ہر مسلمان کو حسنِ خاتمہ کی دولت سے سرفراز فرمائے۔ آمین ثم آمین

باب پنجم
معالجات اشرفیہ

معالجات اشرفیہ

حصولِ احسان وتقویٰ کا فن جس کو اصطلاح عام میں تصوف کہتے ہیں ایک نہایت دقیق فن ہے اس میں حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کو جو نظر عمیق حاصل تھی اس کا اندازہ زیر نظر تالیف کے عنوان ''شان تربیت'' سے عیاں ہے آپ کے معالجات زائد از ہزار صفحات میں ''تربیت السالک'' کے نام سے جمع و محفوظ کئے گئے مگر یہ ذخیرہ غیر منظم شکل میں تھا آپ کے ایک خلیفہ ارشد مولانا محمد عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ صاحب نے جو ظاہر و باطن میں شیخ قدس سرہ کی تصویر تھے، اس منتشر مواد کو مرتب و مدون کیا اور اس کو فن سلوک کی ایک بنیادی و نصابی کتاب کی حیثیت میں لے آئے۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اس تالیف کو پسند فرمایا اور اس کا نام مولف کے نام کی مناسبت سے ''انفاسِ عیسیٰ'' تجویز فرمایا۔

بقول حضرت سیدی مدظلہ انفاس عیسیٰ کیا ہے ایک ''قرابادین تصوف'' ہے اس لقب سے یہ نکتہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جس طرح ''قرابادین اعظم [1]'' کے چھپ کر شائع ہو جانے یا ڈاکٹر کینٹ [2] ''کی ریپوٹری'' (قرابادین) کے دستیاب ہونے کے باوجود اب بھی مریضوں کو اطباء اور ڈاکٹروں کی احتیاج بدستور لاحق ہے اور ان کی تشخیص و تجویز کے بغیر امراض سے نجات محال ہے اسی طرح گو یہ ''قرابادین تصوف'' مجربات سے پر ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کیلئے بھی کسی ماہر طبیب روحانی کی رہبری کی ضرورت ہے چنانچہ جس طبیب حاذق و شیخ کامل کے یہ مجربات جمع کئے گئے ہیں خود اس کا یہ ارشاد ہے:

''بزرگوں سے جو بعض اختیاری مجاہدات منقول ہیں وہ بطور قرب العبد کے نہیں بلکہ محض بطور معالجہ کے ہیں جسکی تجویز کیلئے مجتہد کا اجتہاد یا شیخ کی اجازت ضروری ہے''۔

''اگر کوئی شخص شیخ سے مستغنی ہو جائے تو اس وقت وہ چھوٹا ہونا شروع ہو جائے گا،

ایک اور مقام پر اس سے زیادہ صاف اور واضح ارشاد ہے۔

---

[1] حکیم محمد اعظم خان صاحب کی مشہور و مقبول قرابادین [2] ایک مشہور ہومیو پیتھک ڈاکٹر

[1] ایک دوسری جگہ مشائخ سے تعلق کی ایک اور افادیت بھی بتائی ہے جو نری کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتی، فرماتے ہیں:

''مشائخ اعمال صالح کی وجہ سے بابرکت ہوتے ہیں اس لئے ان کی تعلیم میں بھی برکت ہوتی ہے جس کی وجہ سے جلد شفا ہو جاتی ہے خود کتابیں دیکھ کر علاج کرنا کافی نہیں۔''

اس ضروری تمہید کے بعد اب اسی ''قرابادین تصوف'' سے آج کل کے بعض عام اور مہلک امراض کا صرف ایک ایک نسخہ درج کیا جاتا ہے، جس سے صاحب سوانح علیہ الرحمۃ کی حذاقت اور مہارت فن کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

اختیار کا نسخہ اور ہر مرض روحانی میں اس کی ضرورت

''اختیاری امور میں کوتاہی کا علاج بجز ہمت اور استعمال اختیار کے کچھ نہیں اسی پر مدار ہے تمام اصلاحات کا اور یہی ہے اصل علاج تمام کوتاہیوں کا۔ سارے افعال شرعیہ اختیاری ہیں ورنہ نصوص کی تکذیب لازم آتی ہے پس جب اختیار کا استعمال کرے گا تو کامیابی لازم ہے البتہ دشواری اور کلفت اول اول ضرور ہوگی، لیکن اس کا علاج بھی یہی ہے کہ باوجود کلفت کے ہمت اور اختیار سے برابر بہ تکلف اور بہ جبر کام لیتا رہے رفتہ رفتہ وہ کلفت مبدل بہ سہولت ہو جائے گی۔''

پریشانیوں کا علاج

''عذاب آخرت کا مراقبہ تمام پریشانیوں سے نجات دینے والا ہے اس سے کلفت و کدورت نہیں ہوتی۔ بلکہ اسی فکر سے قلب میں نورانیت وانشراح ہوتا ہے جس کا راز یہ ہے کہ اس فکر سے قلب کو اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور تعلق ہو جاتا ہے اور تعلق مع اللہ تمام پریشانیوں سے نجات دینے والا ہے۔''

بدنظری کا علاج

''بدنگاہی میں ایک درجہ میلان کا ہے جو کہ غیر اختیاری ہے اس پر مواخذہ بھی نہیں اور ایک درجہ ہے اس کے مقتضاء پر عمل کرنے کا یہ اختیاری ہے اس پر مواخذہ بھی ہے اور

---

[1] بالکل ایسے ہی جیسے کوئی مریض کسی طبیب سے مستغنی ہو کر خود ہی اپنا علاج آپ شروع کر دے تو غلط سلط دوائیں کھا کر اپنی صحت وقوت میں خرابی اور کمی پیدا کرتا چلا جائے گا۔

اس عمل میں قصداً دیکھنا اور سوچنا سب داخل ہے اس کا علاج کفِ نفس (نفس کو روکنا) اور غضِ بصر (نگاہ کو نیچی رکھنا) ہے کہ یہ بھی اختیاری ہے کہ ہمت کر کے اس کو اختیار کرے گو نفس کو تکلیف ہو مگر یہ تکلیف نارِ جہنم کی تکلیف سے کم ہے (یعنی نارِ جہنم کی تکلیف کا تصور جمالے۔ (مولف) اور جب چند روز ہمت سے ایسا کیا جائے گا تو میلان میں بھی کمی ہو جائے گی بس یہی علاج ہے اس کے سوا کچھ علاج نہیں اگرچہ ساری عمر سرگرداں رہے۔"

مبتلائے شہوت رانی کا علاج

"معالجہ اللہ تعالیٰ نے ہر مرض کا بنایا ہے استعمال میں ہمت کی ضرورت ہے اس کے اجزا یہ ہیں (۱) پورے چالیس روز خلوت میں رہو (۲) سب سے مطلقاً کلام ترک کردو، ہاں حوائج ضروریہ کے متعلق جو کلام ہو۔ مثلاً کھانے کے متعلق یا بازار کے سودا سلف کے متعلق اور وہ بھی بقدرِ ضرورت مستثنیٰ ہے (۳) کسی کے پاس نہ بیٹھو نہ ملو بجز مجلس شیخ کے (۴) تین روزے متواتر رکھو اور اس میں اوراد سے جو وقت بچے استغفار اور نوافل میں مشغول رہو (۵) جملہ اعضاء کے معاصی سے سخت پرہیز کرو پھر شیخ کو اطلاع دو۔"

غیبت کا علاج

"جس کی غیبت کرے اس کو اپنی حرکت سے اطلاع کر دیا کرے تھوڑے دن اس پر مداومت سے انشاء اللہ تعالیٰ یہ مرض بالکل دفع ہو جائے گا لیکن جس سے معافی چاہے اس کو غیبت کی تفصیل بتلانا ایذا دینا ہے اس لئے اجمالاً یوں کہنا کہ "میرا کہا سنا معاف کرو" کافی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں کے سامنے غیبت کی تھی ان کے سامنے اس کی مدح وثنا کرے اگر بات جھوٹ نہ ہو بلکہ سچ ہو تو یوں کہہ دے کہ بھائی فلاں بات (جس کی بنا پر غیبت ہوئی تھی) پر اعتماد کر کے فلاں شخص سے بدگمان نہ ہونا کیونکہ خود مجھے اس بات پر اعتماد نہیں رہا"۔ (یہ توریہ ہوگا کیونکہ سچی بات پر بھی اعتمادِ قطعی بغیر وحی کے ہو نہیں سکتا) اگر وہ شخص جس کی غیبت کی تھی مرگیا تو اس کے لئے دعا اور استغفار کرتا رہے یہاں تک کہ دل میں یہ یقین ہو جائے کہ اب وہ راضی ہو گیا۔"

کبر کی حقیقت اور اس کا علاج

"نعمت پر فخر کرنا کبر ہے اور اس کو عطائے حق سمجھنا اور اپنی نااہلی کو مستحضر رکھنا "شکر"

ہے اسی طرح کبر و استغنا میں بھی فرق ہے کبر یہ ہے کہ اپنے کو کسی کمال میں دوسرے سے بڑا سمجھنا اور اس کے ساتھ دوسرے کو حقیر سمجھنا اگر یہ نہ ہو (کسی کمال کی وجہ سے دوسرے کی تحقیر متصور نہ ہو) تو ''استغنا'' ہے۔

علاج: تکبر کا علاج تو یہ ہے کہ اپنے عیوب کو سوچا کرے اور یوں سمجھے کہ مجھے اپنے عیوب کا یقین کے ساتھ علم ہے اور دوسرے کے عیوب کا ظن کے ساتھ علم ہے اور جو شخص معیوب یقینی ہو وہ معیوبِ ظنی سے بدتر ہے اس لئے مجھے اپنے کو سب سے بدتر سمجھنا چاہئے اور عملی علاج یہ ہے کہ جس کو تم اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہو اس کے ساتھ تعظیم و تکریم سے پیش آؤ اور یہ عملی علاج جزو اعظم ہے، تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جب تک عملی علاج نہ کیا جائے گا تکبر دور نہ ہوگا۔''

غصہ کا علاج

''جس وقت غصہ آئے امور ذیل کی پابندی کرے (۱) میں بھی حق تعالیٰ کا خطاوار ہوں اگر وہ بھی اس طرح غصہ کریں تو میرا کہاں ٹھکانہ ہو (۲) اگر میں اس کو معاف کردوں گا اللہ تعالیٰ مجھ کو معاف فرمادیں گے (۳) ایسے وقت فوراً کسی کام میں لگ جائے خصوصاً مطالعہ کتب میں (۴) اس جگہ سے ہٹ جائے (۵) اعوذ باللہ کثرت سے پڑھے (۶) پانی پی لے (۷) وضو کرلے۔''

حسد اور غبطہ کا فرق

حسد وہ ہے جس میں محسود سے زوال نعمت کی تمنا ہو اور غبطہ (رشک) وہ ہے کہ اس کے پاس رہتے ہوئے اپنے لئے بھی حصول کی تمنا ہو۔

حسد کا علاج

حسد کا علاج یہ ہے کہ جس سے حسد ہو اس کے لئے ترقی خیر کی خوب دعا کیا کرے اور اس کے ساتھ احسان بھی کرتا رہے خواہ مال سے یا بدن سے یا دعا سے، چند دنوں میں حسد دور ہو جائیگا۔

کینہ اور طبعی انقباض کا فرق اور کینہ کا علاج

کینہ وہ ہے جو اختیار و قصد سے کسی کی برائی و بدخواہی دل میں رکھی جائے، رنج کی

کوئی بات پیش آئے اور اس سے ملنے کو جی نہ چاہے تو یہ کینہ نہیں بلکہ انقباض طبعی ہے جو گناہ نہیں کینہ کا علاج یہ ہے کہ جس سے کینہ ہوا سکے ساتھ بہ تکلف اختلاط و احسان کرے!''

حب جاہ کا علمی و عملی علاج

''اس رزیلہ یعنی (حب جاہ) کی جو مذمتیں اور وعیدیں وارد ہیں ان کا ذہن میں حاضر کرنا بلکہ زبان سے بھی انکی تکرار کرنا بلکہ ان مضامین سے اپنے نفس کو زبان سے خطاب کرنا کہ تجھ کو ان سے عذاب پہنچنے کا اندیشہ ہے اسی کے ساتھ اپنے عیبوں کا استحضار اور نفس کو خطاب کہ اگر لوگوں کو ان رذائل کی اطلاع ہو جائے تو کتنا ذلیل اور حقیر سمجھیں تو یہی غنیمت ہے کہ لوگ نفرت و تحقیر نہیں کرتے چہ جائیکہ ان سے تعظیم و مدح کی توقع رکھتا ہے۔ اسکا عملی جز و یہ ہے کہ مداح کو زبان سے منع کر دے محض سرسری طور پر نہیں بلکہ اہتمام سے اور ساتھ ہی جو لوگ ذلیل شمار کیے جاتے ہیں انکی تعظیم کرے گو نفس کو گراں ہو۔''

ریا کی حقیقت اور اس کا علاج

ریا کی حقیقت یہ ہے کہ عبادت کا اظہار کسی دنیوی غرض سے کیا جاوے یا کسی فعل مباح کا اظہار کسی معصیت کی غرض سے کیا جائے۔

عام صوفیوں کا مشہور قول یہ ہے کہ خلق سے اظہار عبادت ریا ہے اور محققین حضرات کا ارشاد ہے کہ خلق سے اخفائے عبادت بھی ریا ہے کیونکہ مخلوق پر نظر ہی کیوں گئی جو اس سے اخفاء کا اہتمام کیا اگر مخلوق کو کالعدم اور لاشے اور ایسا سمجھتے جیسے مسجد کی صفیں تو ان سے اخفا نہ کرتے۔

علاج: ریا و رضائے خلق سے بچنا چاہتے ہو تو فنا کا طریق اختیار کرو بغیر فنائے کامل کے ریا سے حفاظت نہیں ہو سکتی۔

علاج کذب

''جس کو جھوٹ بولنے کی عادت ہو اس کا عجیب و غریب عملی علاج یہ ہے کہ جس سے کلام کرے اس سے پہلے کہہ دیا کرے کہ ''میری عادت کثرت سے جھوٹ بولنے کی ہے'' تھوڑے دنوں کی مداوت میں انشاء اللہ یہ عادت چھوٹ جائے گی۔

وسوسوں کا علاج

''وسوسہ سے اصلا پریشان نہ ہو بلکہ حضرت حاجی (امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ) فرمایا کرتے تھے کہ ان وساوس کو جمال حق کا مرآۃ (آئینہ) بنالے، اس طرح کہ یوں مراقبہ کرے کہ اللہ تعالیٰ کی کیسی عجیب قدرت ہے کہ دل میں ایک دریا خیالات کا پیدا کر دیا ہے جس کی کہیں انتہا ہی نہیں اور جو کہیں رکنا ہی نہیں۔ اسی طرح وساوس کو قدرت حق کی معرفت کا وسیلہ بنانے سے انشاء اللہ وہ خود بند ہو جائیں گے، کیونکہ شیطان کا مقصود تو وساوس سے یہ ہے کہ خدا سے بعید کرے۔ جب خود ان وساوس ہی کو قرب کا وسیلہ بنالیا تو اب شیطان وسوسے ڈالنا بند کر دے گا، غالباً شیخ ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ وساوس سے خوش ہوا کرو، یعنی خوشی ظاہر کیا کرو کیونکہ شیطان کو علم غیب نہیں ہے جب تم خوشی ظاہر کرو گے تو وہ یہی سمجھے گا کہ دل سے خوش ہو رہا ہے اور وہ مسلمان کو خوش کرنا نہیں چاہتا اس لئے وسوسہ ڈالنا بند کر دے گا۔

حصول راحت کا نسخۂ اکسیر

''تم اپنی طرف سے بلا تجویز کرو نہ راحت بلکہ وہ جو تجویز کر دیں اس پر راضی رہو، حضرت یہ نسخہ اکسیر ہے جس سے نہ اہل دنیا کو استغنا ہے نہ اہلِ دین کو، نہ علماء کو استغنا ہے نہ عرفا کو بلکہ تمام عالم اس کا محتاج ہے۔''

اسراف سے بچاؤ کی تدبیریں

(۱) اہل اللہ کا مذہب (یعنی طریقہ) رکھو، وضعدار لوگوں کا مت رکھو، رسم و رواج کے ذرا بھی مقید نہ بنو (۲) بلا ضرورت ہرگز مقروض مت بنو گو رسم و رواج کے خلاف کرنا پڑے (۳) سب سے پہلے انتخاب گھر کا کرو، جتنی چیزیں کام میں آتی ہوں رہنے دو اور جتنی چیزیں کام میں نہ آئیں خارج کر دو، یا بیچ دو یا مسکین کو دیدو، نفلی صدقہ دینے کی ہمت نہ ہو تو زکوٰۃ ہی میں دیدو (۴) گھر کا معائنہ کیا کرو، گھر میں بہت سی چیزیں ایسی ہوں گی جو سڑ رہی ہوں گی، کسی کو دیمک لگ رہی ہوگی، ایسی چیزوں کو اپنی ملک سے الگ کر دو تاکہ گھر میں رونق ہو (۵) روزمرہ معاشرت میں یہ مقرر کر لو کہ جو کام کرو سوچ کر کرو، بے تامل مت کر ڈالو (۶) کسی کے کہنے سے کوئی کام مت کرو (یعنی محض مروتاً جب

کہ اپنے پاس اسکی گنجائش نہ ہو) بس اپنی رائے پر (یعنی اپنی مال گنجائش کا اندازہ لگا کر) عمل کرو!"

مجاہدہ کا مقصد

"مجاہدہ سے مقصود نفس کو پریشان کرنا نہیں بلکہ نفس کو مشقت کا خوگر بنانا اور راحت و تنعم کی عادت سے نکالنا ہے اور اس کے لئے اتنا مجاہدہ کافی ہے جس سے نفس پر کسی قدر مشقت پڑے بہت زیادہ نفس کو پریشان کرنا اچھا نہیں ورنہ وہ معطل ہو جائے گا۔"

نفس کو آرام پہنچانے اور سزا دینے کا طریقہ

نفس کے ساتھ بچوں سا معاملہ کرو کہ بچوں سے جب کوئی کام لینا ہوتا ہے تو اول اس کو مٹھائی وغیرہ دے کر بہلاتے ہیں، اگر اس سے بھی نہ مانے تو دھمکی سے کام لیتے ہیں، اگر اس سے بھی نہ مانے تو بس دے چپت دے چپت!! اسی طرح تم بھی نفس کے حظوظ (خوشیوں) کو تو پورا نہ کرو باقی حقوق ادا کرتے رہو خوب کھلاؤ پلاؤ، اچھی طرح کام لو ۔

کہ مزدورِ خوش دل کند کار بیش

ہاں جب کسی طرح باز نہ آئے تو اب سزا دو مگر خود سزا نہ دو بلکہ کسی (شیخ) کے حوالے کر دو، وہ مناسب سزا تجویز کرے گا۔ ورنہ جو لڑکا اپنے ہاتھ اپنے چپت مارے گا وہ تو آہستہ مارے گا اور محقق سزا کافی دے گا مگر حقوق نہ تلف کرے گا۔"

ذکر میں بار محسوس ہونا اور اس کا علاج

"بار ایک مشقت ہے مشقت میں اگر جی نہ لگے تو سمجھ لو کہ خود مشقت بھی نفع میں جی لگنے سے کم نہیں، جس طرح بھی ہو حتی الوسع پورا کر لیا جائے۔ شدہ شدہ سب دشواری مبدل بہ آسانی ہو جائے گی۔"

"ذکر میں لطف و لذت کا حاصل ہونا ایک نعمت ہے اور نہ ہونا دوسری نعمت ہے جس کا نام مجاہدہ ہے، یہ اول سے انفع (زیادہ مفید) ہے گو یا الذ (زیادہ لذیذ) نہ ہو۔

'ذکر کا اثر موقوف ہے تقلیل کلام، تقلیل اختلاط مع الانام وقلت التفات الی التعلقات (یعنی تعلقات پر توجہ نہ دینا) پر۔ ان چیزوں کے حصول کے لئے مواعظ کا اور مثنوی کا مطالعہ کرنا چاہئے خواہ سمجھ میں نہ آئے!!"

دھیان اور دھن ضروری ہے

''افسوس عوام تو کیا علماء میں بھی نماز و روزہ تو ہے مگر دھیان اور دھن اور اللہ تعالیٰ سے تعلق، ان سے لگنا لپٹنا، ان کی محبت میں گھلنا، یہ نہیں ہے اور بدون اس کے کام نہیں چلتا کیونکہ بدون اس کے نماز روزہ پر استقامت، خطرہ میں رہتی ہے، ہر وقت نفس سے منازعت (جنگ) رہتی ہے اور ظاہر ہے کہ منازعت کے ساتھ اول تو کام ہی خود دشوار ہوتا ہے پھر اس پر دوام کی امید نہیں، اور تعلق مع اللہ کے ساتھ منازعتِ نفس ختم ہو جاتی ہے اور دوام عمل کی امید غالب، قریب بہ یقین ہو جاتی ہے۔''

توحید کی برکت

''موحد کو ایسا آرام ہوتا ہے جیسا بچہ کو ماں کی گود میں اطمینان ہوتا ہے، بچہ ماں کی گود میں جا کر بالکل بے فکر ہو جاتا ہے کہ بس اب کسی کا خوف نہیں۔''

حضور ﷺ کی اتباع کے معنے

''حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ حضور ﷺ کا اتباع یہ ہے کہ جو افعال وصفات آپ کے اصلی دائمی ہوں کہ زیادہ غلبہ اور ظہور انہی کا ہو اور جو صفات وافعال حضور ﷺ کے لئے عارضی ہوں وہ تمہارے اندر بھی عارضی ہوں!!''

پنج گنج اشرف

خصائل رذیلہ کو دور کرنے کے چند نسخے لکھے جا چکے، آخر میں حکیم الامت کی پانچ انمول ہدایتیں لکھی جاتی ہیں، ان پر نظر اور عمل ہو تو انشاء اللہ تعالیٰ روحانی صحت کبھی بگڑنے نہ پائے گی، بلکہ دن بدن اس میں ایک بے پناہ قوت و طاقت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ ارشاد ہے:

(۱) حب رسول ﷺ اور حب شیخ مفتاح سعادت ہے۔

(۲) عمر بھر اس کی ضرورت ہے کہ اپنے نفس کی نگہداشت رکھے۔ اور علاج میں لگا رہے۔ کاملین بھی اس سے فارغ نہیں۔ صرف ضعف وقوت کا فرق ہے نہ یاس ہونا چاہئے نہ فراغ۔

(۳) استقامت علی الاعمال خود ایک رفیع حالت ہے، جو سب کیفیات سے راجح ہے!

(۴) ثمرات پر نظر کرنا سبب ہے پریشانی کا!

(۵) انسان صرف مکلّف اس کا ہے کہ اخلاق رذیلہ کے مقتضیات پر عمل نہ کرے، رہا یہ کہ اقتضار آت ہی زائل یا ضعیف ہو جائیں اس کا انسان نہ مکلّف ہے نہ یہ بسہولت میسر ہو سکتا ہے۔

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے!

اب دعا ہے کہ:

اے ارحم الرحمین اپنے محبوب ﷺ کی امت مرحومہ کے اس رہبر مشفق کو اپنی رحمت خاصہ کے آغوش میں سکون نصیب فرما اور اس کو اپنی خوشنودی و رضا سے شاد و کام فرما، اس کے آثار و نقوش کو عموم و دوام عطا فرما۔ اے بارے الہا! اس مولف حقیر اور ناشرِ تالیف کو اور کمترین کاتب کتابِ ہذا کو خصوصاً اور اپنے بندۂ اشرف کے تمام محبین و معتقدین کو خصوصاً اور سارے مسلمانوں کو عموماً اتباعِ سنت مقدسہ اور استقامت دین حنیف کی توفیق بخش اور حسن خاتمہ کی دولت لازوال ان کے لئے مقدر فرما۔

ندارم غیر از تو فریاد رس
توئی عاصیاں را خطا بخش و بس

آمین برحمتک یا ارحم الرحمین. وصلی اللہ تعالیٰ
علی محمد نبی الامی وعلی الہ واصحابہ اجمعین

تمت